علاّمہ مولانا محمد علی لاہوریؒ
عصر حاضر کا پیشرو مفسّرِ قرآن

(ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

تالیف و پیشکش

ڈاکٹر خورشید عالم ترین
(مترجم قرآن بزبان ہندی)

﴿جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں﴾

کتاب کا نام : علاّمہ مولانا محمد علی لاہوریؒ
عصر حاضر کا پیشرو مفسّر قرآن
(ایک تاریخی اور تحقیقی جائزہ)

مصنف : ڈاکٹر خورشید عالم ترین

سن اشاعت : ۲۰۱۹ء

ناشر : اے۔اے۔آئی۔آئی۔ہند
پاکٹ 'ایل' جنتا فلیٹس 25/A
گراونڈ فلور ، دلشاد گارڈن ،
نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۹۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال

حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ (وفات 1951ء) کا مایۂ ناز اور مقبول عام انگریزی ترجمہ قرآن بمع تفسیری حواشی ولایت میں چھپ کر 1917ء میں منظر شہود پر آیا۔ تب سے اب تک اپنی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب نے اپنی وفات سے پہلے اس پر نظر ثانی بھی فرمائی تھی، آج کل یہی نظر ثانی شدہ ایڈیشن دستیاب ہے۔

اردو زبان میں مولانا موصوف کا مشہور زمانہ اور نادر تفسیری شاہکار اُردو تفسیر ''بیان القرآن'' ہے۔ یہ تفسیر تین جلدوں میں بڑی آب وتاب کے ساتھ لاہور سے (1922ء تا 1924ء) شائع ہوئی۔ کتابت کے لئے اُس دَور کے نامور خطاط مولوی عبدالقادر خوشنویس کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس خطاطی نے مولانا آزاد کو بھی مسحور کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی سورہ فاتحہ کی تفسیر ''اُم القرآن'' کے لئے خاص طور پر اسی کاتب کو منگوایا تھا (خطوط ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ ص ۲۱۱)۔ تقسیم ہند کے بعد تفسیر بیان القرآن کو از سرِ نو نہایت عمدہ کتابت کے بعد آفسیٹ پر چھاپا گیا۔ پہلے کی نسبت کاغذ باریک ہونے کے سبب حجم دو جلدوں میں سمٹ گیا۔ اس کا ایک نہایت خوبصورت اور دیدہ زیب خصوصی ایڈیشن امریکہ سے شائع ہوا ہے۔ الیکٹرانک ٹائپ سیٹنگ میسر آجانے سے انشاء اللہ عنقریب اور زیادہ باریک کاغذ یعنی بائبل پیپر پر ایک ہی جلد میں دستیاب ہو جائے گی۔ انگریزی اور اُردو دونوں ہی تفسیروں کے اب تک متعدد ایڈیشن چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذَالِک!**

محترم ایچ۔ امیر علی صاحب نے اپنی مشہور تالیف ''دی سٹوڈنٹس قرآن'' کی ابتداء میں انگریزی زبان میں شائع شدہ تراجم قرآنی کا ایک تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ جس میں حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ کی انگریزی تفسیر کے بارے میں یوں لکھا ہے :

''مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیرِ قرآن دُنیا کی وہ پہلی تفسیر ہے جو

ایک ایسے مسلمان کے ہاتھوں انجام پائی جس میں قران دانی اور قرآن کی ترجمانی کی پوری صلاحیت اور استعداد موجود ہے۔ اس تفسیر نے دورِ جدید کی عالی پایہ مطبوعات کے سارے معیار اور تقاضے پورے کر دیئے ہیں۔''

("The Student's Qur'an", page iv)

مؤرخِ اسلام علامہ ڈاکٹر محمد اکرامؒ لکھتے ہیں:

''مولانا محمد علی امیر جماعت (احمدیہ لاہور) کا ترجمہ وتفسیر قرآن انگریزی زبان میں پہلا ترجمہ تھا جو کسی مسلمان کے ہاتھوں پر انجام پایا۔.....آجکل کلام مجید کے متعدد انگریزی ترجمے شائع ہو رہے ہیں لیکن شرف اوّلیت مولانا محمد علی ہی کو ہے۔ اور گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمد علی کا ''ترجمۃ القرآن'' ہے۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد (وفات 1957ء) نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اُسکا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے پچیس سال پہلے پیش کر دیا تھا۔'' (موج کوثر۔ص105۔طبع اوّل۔ناشر تاج کمپنی لاہور)

یہ اکیلے مولانا آزاد مرحوم کی بات نہیں۔ مابعد کے سبھی روشن خیال مترجمین ومفسرین نے کسی نہ کسی رنگ میں مولانا محمد علی کی ضرور اتباع کی ہے۔ مولانا موصوف کے سوانح نگاروں نے اردو تفسیر ''بیان القرآن'' کی مقبولیت اور افادیت کے بارے میں لکھا ہے:

''اس تفسیر کی مقبولیت اور افادیت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے۔ کہ بڑے بڑے غیر احمدی اور مخالف مولوی صاحبان بھی اس کو درس قرآن دینے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ بہت سے احباب نے مشاہدہ کیا ہے کہ خود مکّہ معظّمہ اور مدینہ منورہ میں اس تفسیر سے درس دیا جاتا رہا ہے۔ اور اس کے بعض حصّوں کے عربی تراجم بھی ہوئے ہیں۔ اور یہ بات بھی مشاہدہ میں آچکی ہے کہ بعض مخالف مولوی صاحبان، جو کسی مصلحت

کی بنا پر احمدیوں کو کافر کہنے پر مجبور ہیں ، اس تفسیر کے سرورق کو علیحدہ کر کے (جس پر مولانا محمد علی اور احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کا نام ہے) باقی کی کتاب اپنے سامنے درس قرآن دیتے وقت رکھتے رہے ہیں۔''

(مجاہد کبیر۔ص ۱۵۵۔طبع ۱۹۶۲ء۔ناشر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور)

برصغیر ہندوپاک کے نامور راسخ العقیدہ مفسر ومفکر ، صاحب قلم و جید عالم دین مولانا عبدالماجد صاحب دریابادیؒ (وفات 1977ء) اپنا ذاتی معاملہ پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مولانا محمد علی صاحب نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلام کی جو مہتمم بالشان خدمت سرانجام دی ہے۔اس کا اعتراف نہ کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔اس ترجمہ کی بدولت نہ صرف ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی ، بلکہ ہزاروں مسلمان بھی اسلام کے زیادہ قریب آ گئے ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔میں نہایت مسرت سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو چودہ پندرہ سال پہلے، جب میں ظلمتوں اور دہریت کی گہرائیوں میں بھٹک رہا تھا، میرے لئے شمع ہدایت بن کر آئیں ۔اور مجھے اسلام کا سیدھا راستہ سمجھایا۔ کامریڈ اخبار والے مولانا محمد علی (جوہر) مرحوم بھی اس ترجمہ کے بہت شائق تھے اور وہ ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔''

(اخبار ''سچ '' 25 جون 1932ء)

اللہ کی شان! دہریت کی گہرائیوں سے اُبھر کر باہر آنے والا یہ شخص آگے چل کر خود بھی مفسر قرآن بن گیا۔علمی اور دینی حلقوں میں مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی اُردو اور انگریزی تفسیریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔مولانا دریابادی حضرت مولانا محمد علی کی لاثانی، بلند پایہ اور غیر معمولی اُردو تفسیر (بیان القرآن) کے متعلق یہ تاریخی ریمارک بطور یادگار پیچھے چھوڑ گئے ہیں :

''سب سے بڑھ کر ان کی (یعنی مولانا محمد علی لاہوریؒ کی) اردو تفسیر ''بیان القرآن'' تین جلدوں میں ..... بحیثیت مجموعی بڑی قابل قدر ہے۔اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش دل پر ثبت کر دینے والی۔'' (معاصرین۔ص 43 تا 44 طبع اوّل)

یہ مولانا موصوف کی اپنی وفات سے صرف دو تین برس پہلے کی رائے ہے۔اس تاریخی جملے میں مولانا دریابادی نے سچ مچ دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔قرآن پاک کی صحیح ترجمانی اور حقیقی تفسیر کا اس سے بہتر الفاظ میں تعارف ممکن نہیں، کہ وہ :

''اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش قاری کے دل پر ثبت کر دے۔''

مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسری نے سن ۱۹۳۲ء میں پادری سلطان محمد پال کے قرآن کریم پر اعتراضات کا جواب ''برہان التفاسیر'' کے عنوان سے اپنے اخبار ''اہلحدیث'' میں شائع کیا تھا، جس کو اب کتابی شکل میں بھی شائع کیا گیا ہے۔اس میں صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۰ پر مولانا محمد علی لاہوری کی مایہ ناز تفسیر ''بیان القران'' کا یہ اقتباس درج کیا گیا ہے:

''قرآن شریف عربی تصانیف میں ایک بے نظیر کتاب ہے اور ہمیشہ عربی زبان کی فصاحت کا معیار مانا گیا ہے۔لیکن اس پاک کتاب کی بڑی خصوصیت جس میں کوئی دوسری کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔اس کی وہ عجیب کایا پلٹ کرنے والی طاقت ہے جو اس کے کام سے ظاہر ہوئی۔اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی مدعی خود یہ پاک کتاب اپنے آغاز ہی میں ہے۔یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں یہ ہدایت ہے متقیوں کے لئے۔''

احمدیت کا کٹر مخالف ہونے کے باوجود مولانا موصوف نے یہ ریمارک رقم فرمایا :

''مولوی محمد علی صاحب نے جو قرآن مجید کی کشش کا ذکر کیا ہے سونے سے لکھنے کے قابل ہے''۔

ہم بھی اس عرضداشت کو اسی تاریخی جملے پر ختم کرتے ہیں۔زیر نظر کتاب کی تیاری کے لئے مواد اتنا زیادہ وسیع اور متنوع تھا کہ سمیٹنا خاصا مشکل ہو گیا۔بہت سے پہلو تشنہ ہی رہ گئے۔اللہ نے چاہا تو اگلے ایڈیشن میں تلافی کر دی جائے گی۔والسلام۔

احقر العباد

خورشید عالم ترین

فہرست مضامین

**عرض حال۔۔۔

نامور اکابر علماء کی آراء

- مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ 49
- الحاج حافظ غلام سرورؒ 50
- امرتسر کے معتبر اور مشہور اخبار وکیل کا تبصرہ 51
- مولانا عثمان غنی طاہر 52
- مصر کے علامہ شکیب ارسلانؒ ---------- 53
- مدیر رسالہ 'انجمن حمایت اسلام' لاہور ---------- 54
- ڈاکٹر اسرار احمدؒ 54
- مولانا عبدالمجید خان مدیر رسالہ ''مولوی'' 55
- مولانا رحمت اللہ طارق ---------- 55
- ایک اور مثال ---------- 58

حضرت مولانا محمد علی صاحب کا انگریزی ترجمہ قرآن مع تفسیر اور اُردو تفسیر 'بیان القرآن' بحیثیت دو پیش رو تفسیریں

- علامہ یوسف علیؒ 60
- الحاج حافظ غلام سرورؒ 60
- مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال 61
- مولانا مرزا ابوالفضل ---------- 62
- امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ---------- 64
- ذوالقرنین کی تاریخی تحقیق 65

- حضرت ابراہیم اور پرندے 65
- اصحاب کہف کون تھے 67
- حضرت ابراہیم اور تین جھوٹ 70
- جھوٹ نمبر 1 پر مولانا محمد علی کا تبصرہ 72
- جھوٹ نمبر 2,3 پر مولانا محمد علی کا تبصرہ 73
- مولانا آزاد کی رائے 74
- جمہور کا خوف اور ذو معنی الفاظ کا استعمال 76
- وفات مسیح 77
- حضرت سلیمان اور ہوا 80
- آیات قرآنی کے ترجمہ میں پوری احتیاط.....84

مفسر قرآن سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفہیم القرآن ---- 111 - 89

ایران کے شیعہ مفسر قرآن

جناب زین العابدین رہنما 112

مابعد کے مفسرین پر حضرت مولانا محمد علی صاحب کا اثر----118-134

'بیان القرآن'

(کچھ عدیم المثال شہ پارے)

(۱)۔سورۃ الفاتحہ کی عظمت 137
(۲)۔منعم علیھم کون ہیں؟ 139
(۳)۔اَللّٰہُ یَسۡتَھۡزِئُ بِھِمۡ(البقرہ :۱۵) کی تشریح 141
(۴)۔بنی اسرائیل کا بندر بننا..... 143
(۵)۔ابن مریم نام کی وجہ---------- 144
(۶)۔غذاؤں کا اثر اخلاق پر ---------- 147
(۷)۔شراب اور جوا 148
(۸)۔عورت کی گواہی 151
(۹)۔حضرت مریم کا ملنے والا رزق 152
(۱۰)۔بن یامین کی بوری میں پیالہ حضرت یوسف نے نہیں رکھا..... 156
(۱۱)۔حضرت سلیمان اور انکے عصا کو دیمک کے کھانے کا قصہ..... 158
(۱۲)۔آیت خاتم النبیین کی تشریح 159
(۱۳)۔سورۃ الاخلاص 164

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

مولانا محمد علی لاہوری کی عظیم شخصیت اور انکی بے مثال خدمات اسلام

(ایک مختصر تعارف)

ایک زمانہ وہ تھا جب انصاف پرور اور خدا ترس علماء کھلے عام اس بات کا اقرار کرتے تھے کہ:

''مولانا محمد علی ایم اے۔ایل،ایل بی (امیر جماعت احمدیہ لاہور)۔۔۔۔نے اپنی طویل تصنیفی زندگی میں اپنے قلم کے ذریعہ جو خدمات اسلام کی انجام دیں وہ اپنی جگہ پر بے مثل و بے مثال ہیں۔انگریزی خوانوں بلکہ انگریزیت زدہ اُردو خوانوں کے بھی حق میں ان کا قلم ایک نعمت عظمیٰ تھا۔خدا جانے کتنوں کے ایمان انہوں نے قائم کر دیئے۔اور یورپ اور امریکہ وغیرہ کے کتنے بھٹکے ہوؤں کو انہوں نے اسلام کی راہ دکھائی''۔

(مشہور عالم دین اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی ایڈیٹر صدق جدید)

''کسی زندہ انسان نے اسلام کی تجدید اور نشاۃ ثانیہ کے لئے لاہور کے مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ قیمتی اور طویل خدمات انجام نہیں دیں۔اُن کے تصنیفی کارناموں کی وجہ سے تحریک احمدیت ایک خاص شہرت اور امتیاز کی مالک بن گئی۔''

(قرآن پاک کا مشہور انگریز نومسلم مترجم، جناب محمد مارماڈیوک پکتھال)

اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ علماء ایک خاص مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کے اس عظیم الشان حامی اور خادمِ بے بدل کی شخصیت اور اسکی بے مثل و مثال خدماتِ دینیہ سے بکلی انجان اور بے خبر رکھنا چاہتے ہیں۔وجہ ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ آج علماء جن جدید اور ترقی یافتہ دینی افکار کو اپنی میراث و ملکیت مانتے ہیں، اُن کا اصل سرچشمہ احمدؑیہ علم الکلام ہی ہے۔اس جدید علمی سرمایہ کے ماخذ کی نشاندہی علماء کی شان و وجاہت کے لئے نقصان دہ ہے۔اور ایسا کرنے

سے ان کے پاس تکفیر ومخالفت کا جواز بھی باقی نہیں رہتا۔

حق چھپ تو سکتا ہے مٹ نہیں سکتا

کسی نے کیا خوب کہا ہے: ''حق کو طاقت کے زور پر کچھ دیر کے لئے چھپایا یا دبایا تو جاسکتا ہے لیکن مٹایا ہرگز نہیں جاسکتا۔'' پاکستانی علماء نے حکومتِ وقت سے ملکر احمدیت کو مٹانے اوراس کی ترویج واشاعت کو روکنے کے لئے ہر ممکن حربہ استعمال کیا۔ مسلمانوں کی نئی نسل کو احمدی مسلمانوں سے ملنے اوران کا لٹریچر پڑھنے سے زبردستی روک دیا گیا اور دوسری طرف احمدیوں سے یہ بنیادی حق بھی چھین لیا کہ وہ عدالت میں جا کر اپنی بے گناہی ثابت کریں۔ لیکن پاکستانی علماء یا اُن کی ناانصاف حکومت اللہ تبارک وتعالیٰ کو جو احکم الحاکمین ہے، اپنا فیصلہ سنانے سے روک نہیں سکتے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا طاقتور غیبی ہاتھ اندر ہی اندر کام کرتا رہتا ہے۔ چنانچہ deensearchcenter.com کا یہ غیر جانبدارانہ اور منصفانہ بیان پاکستان کے تنگ نظر علماء اور غیر منصف حکومت کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا پردہ فاش کرنے کے لئے کافی ہے:

THE HOLY QURAN

Maulana Muhmmad Ali

Muhammad Ali's understanding of the Qur'an is a must-read for everybody. His universal and inclusive approach, and his use of classical as well as modern *'Tafsir'* (especially Sayyid Ahmad Khan), makes this one of the best rational and honest commentaries on the Qur'an. Being form Lahori Ahmadiyya, which is not dogmatic sectarian as the Qadani counterpart, has been wrongfully labeled as heretical. His innovating insights show the progress of Muslim thought in the 20th century.

ترجمہ: ''مولانا محمد علی صاحب کی بلند پایہ قرآنی بصیرت کے بارے میں اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اس کا مطالعہ ہر شخص کے لئے (عامی ہو یا خاص) ازبس ضروری ہے۔ مولانا موصوف کی عالمگیر اپروچ (approach) نے، نیز تفسیر کی تیاری میں مستند تفاسیر قدیمہ کے ساتھ ساتھ تفاسیر جدیدہ (خاص کر سرسید احمد خان صاحب کی تفسیر) سے استفادہ، اِن تمام خوبیوں نے مولانا محمد علی کی تفسیر کو قرآن پاک کی ان اعلیٰ ترین تفسیروں

میں شامل کر دیا ہے جو اپنی روشن خیالی اور ایماندارانہ نہج کے لئے مشہور ہیں۔ مولانا موصوف کا تعلق احمدیوں کی لاہوری شاخ سے ہے۔ جو اپنے دوسرے فریق یعنی قادیانی جماعت کی طرح کٹر فرقہ پرست نہیں۔ بدقسمتی سے مولانا موصوف کو بھی کافر قرار دے دیا گیا ہے، جو بات سراسر غلط اور حق سے دُور ہے۔ 20ویں صدی کے ترقی یافتہ افکار اسلامیہ کی جدّت مولانا محمد علی کے افکارِ عالیہ ہی کی دَین ہے۔''

www.al-hidaayah.co.uk نے محترم ابوعمار یاسر قاضی کی ایک عمدہ انگریزی تالیف (An Introducton to the Sciences of the Qur'aan) یعنی ''مقدمہ علوم القرآن'' نیٹ پر ڈالی ہے۔ اس میں "English translations by Muslims" عنوان کے تحت صاف اعتراف موجود ہے:

''مولانا محمد علی صاحب (لاہوری) کا انگریزی ترجمۃ القرآن سن ۱۹۱۶ء میں منظر شہود پر آیا۔ قادیانی (احمدی) مکتبہ خیال سے وابستہ ہونے کے باوجود یہ ترجمہ مابعد کے متعدّد جانے مانے انگریزی تراجم پر اپنی چھاپ اور اثر ڈالنے میں کامیاب ہوگیا۔ خصوصاً مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال، علامہ یوسف علی، حافظ غلام سرور، مولانا عبدالماجد دریابادی اور شاکر صاحب کے تراجم پر۔'' (صفحہ ۳۵۹)

یہی اعتراف عصر حاضر کے مشہور مسلمان تاریخ دان ڈاکٹر شیخ محمد اکرام (ایم، اے، پی، ایچ ڈی) نے یوں کیا ہے:

''لاہوری جماعت مرزا صاحب کی معتقد ہے لیکن اُس کے ساتھ ساتھ وہ حتی الوسع اپنے آپ کو عام مسلمانوں سے وابستہ رکھنا اور اُن کے دُکھ سُکھ میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی ہے۔ لاہوری احمدی غیر احمدیوں کو کافر نہیں کہتے۔ مرزا صاحب کی نبوت کے قائل نہیں، بلکہ انہیں حضرت مجدد الف ثانی اور دوسرے بزرگوں کی طرح ایک مجدد مانتے ہیں۔ لاہوری جماعت احمدیہ کا نظم ونسق انجمن اشاعت اسلام لاہور کے ہاتھ میں ہے۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی جنہوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مذہب کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اس کے صدر ہیں.....

ایک اہم کام جو یہ جماعت کررہی ہے ،قرآن مجید کی اشاعت ہے ۔ بالخصوص انگریزی دان مسلمانوں اورغیرمُسلموں میں۔مولوی محمدعلی امیر جماعت احمدیہ کا ترجمہ وتفسیر قرآن انگریزی زبان میں پہلا ترجمہ تھا، جوکسی مسلمان کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ترجمے کے علاوہ آپ نے کلام مجید کی مختلف سورتوں کی تقسیم وترتیب کرکےاوران کے مضامین کا خلاصہ دے کرمطالب قرآن کوواضح کیا ہےاورکوشش کی ہے کہ صرف الفاظ پرہی توجہ نہ رہے بلکہ کلام مجید کے ارشادات اورخیالات بھی وضاحت سے ذہین نشین ہوجائیں۔

آج کل کلام مجید کے متعددانگریزی ترجمے ہورہے ہیں۔لیکن شرفِ اوّلیت مولانا محمدعلی کے ترجمہ ہی کو ہے۔اورگذشتہ ربع صدی میں انگریزی خواں طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمدعلی کا ''ترجمۃ القرآن'' ہے۔آج مولانا ابوالکلام آزاد نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کیلئے جو طریقہ اختیار کیا ہے۔اُس کا نمونہ مولوی محمدعلی نے اب سے پچیس سال پہلے پیش کردیا تھا۔''

(موج کوثر،ص105،طبع اوّل،مطبوعہ تاج کمپنی)

'موج کوثر' کے دوسرے ایڈیشن میں مولانا آزاد والا جملہ حذف کردیا گیا ہے۔یقیناً ایسا علماء کے دباؤ میں آکر ہی کیا گیا ہوگا۔کیونکہ علماء کے دباؤ یا برہمگی کی جھلک آگے صاف دکھائی دیتی ہے، جہاں اپنے بچاؤ کیلئے مولانا عبدالماجددریابادی مرحوم کی ایک متذبذب اورغیرمعقول سی عبارت کو ڈھال بناکر پیش کیا ہے۔ڈاکٹرمحمداکرام لکھتے ہیں :

''مولانا عبدالماجددریابادی اس ترجمے کی نسبت لکھتے ہیں:

''غالبًا اگست1920ء تھا کہ ایک عزیز کے پاس مولوی محمدعلی لاہوری کاانگریزی ترجمۃ القرآن پڑھنے میں آیااور طبیعت نے اُس سے بھی بہت گہرااور اچھااثر قبول کیا۔مغربی راہ سے آئے ہوئے بیسوں شبہات واعتراضات اس ترجمہ وتفسیر سے دور ہوگئے۔اور یہ رائے اب تک قائم ہے۔ اس بیس سال کے عرصے

میں خامیاں اور غلطیاں بہت سی (بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں جن کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں) اس ترجمہ وتفسیر کی علم میں آ چکیں۔ **لیکن انگریزی خوانوں اور مغرب زدوں کے حق میں اس کے مفید اور بہت مفید ہونے میں ذرا بھی کلام نہیں۔** ہدایت کا واسطہ جب اللہ کی حکمت صریح غیر مسلموں کے کلام کو بنا دیتی ہے تو یہ تو بہر حال اللہ کے کلام کا ترجمہ وحاشیہ ہے۔ مترجم کی بعض اعتقادی غلطیوں کی بنا پر ان کی ساری کوششوں سے بدظن ہو جانا قرین انصاف ومقتضائے تحقیق نہیں۔'' (موج کوثر، طبع ثانی۔ص 181 تا 182)

اب جو چیز دل کی گہرائیوں کو چھو کر اپنا اچھا اثر ڈالے، شبہات واعتراضات کو دور کرنے میں کارگر ہو، انگریزی خوانوں اور مغرب زدہ حضرات کے لئے مفید تر بھی ہو، سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسی کے بارے میں غلط یا نا درست ہونے کا فیصلہ کیسے دیا جا سکتا ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ ایسی رائے قدامت پسند معاصر علماء کے غیض وغضب کو کم کرنے یا مخالفت سے بچنے کے لئے ہی تحریر کی گئی ہے۔ کیونکہ اس بیان میں ایک نہیں بلکہ متعدد متعارض ومتناقض باتیں کہی گئی ہیں۔ بات دراصل اتنی ہی ہے کہ ہمارے علماء کرام قدیم تفاسیر یا اپنے کسی مروج نظریہ یا عقیدہ کے خلاف کچھ سننا ہی نہیں چاہتے۔ چاہے اُن کا یہ عقیدہ، رائے یا نظریہ قرآن، حدیث، تاریخ یا عقل سلیم کے کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ سادہ سے سادہ معاملے کو بھی خواہ مخواہ پیچیدہ یا پھر خرق عادت بنا دینا گویا اُن کی گھٹی میں ہے۔ ایک معمولی سی مثال اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا کی شادی کا مسئلہ ہے۔ مخالفین اسلام اس معاملے کو آج بھی کافی سے زیادہ اُچھال دے رہے ہیں۔ امام بخاریؒ نے راوی کے کہنے پر یہ لکھ دیا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت فقط نو سال تھی۔ اب کیا تھا ہمارے قدامت پسند علمائے کرام کے لئے یہی بات اللہ کا فرمان، اور پتھر کی لکیر بن گئی۔ اس پر غور وفکر کرنا یا صحت وصداقت کو از سر نو جانچنا دین میں کھلی مداخلت یعنی ایک سنگین جُرم ہو گیا۔ حالانکہ قرآن کریم جگہ جگہ قاری کو اپنے مندرجات (یعنی کلام اللہ) پر کھلے غور وفکر اور کامل تدّبر کی دعوتِ عام دیتا ہے۔ لیکن ہمارے علماء امام بخاریؒ اور اور ان کے راوی کو معصوم عن الخطا سمجھ کر ہر طرح کی تنقید یا اختلاف سے

بالاقرار دیتے ہیں۔اور یک زبان ہوکر یہی کہتے کہ یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔کیونکہ عرب گرم علاقہ ہے وہاں لڑکیاں کم سنی ہی میں بلوغت کو پہنچ جاتی ہیں۔اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا اب کیوں نہیں ہوتا۔عرب لڑکیاں بھی عام لڑکیوں کی طرح ایک خاص عمر کو پہنچ کر ہی بالغ تسلیم کی جاتی ہیں۔جو کسی بھی صورت میں ۹ سال نہیں ہوسکتی۔اس لئے جب اصل واقعات کی از سر نو چھان بین کر کے حضرت مولانا محمد علی صاحب نے تاریخی اور عقلی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ رخصتی کے وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کسی بھی طور ۹ سال کی کم سن بچی نہ تھیں بلکہ پورے طور بالغ ہو چکی تھیں ۔تو اس تحقیقِ جدید کو دیکھ کر نام نہاد مولوی صاحبان کے ساتھ ساتھ قدامت پسند علماء بھی ناراض ہوگئے ۔رسالوں اور اخباروں میں مولانا محمد علی لاہوریؒ کے خلاف ایک باقاعدہ جنگ چھڑ گئی ۔ معرکہ آرائی کرنے والوں میں مشہور سیرت نگار مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم بھی تھے۔وہ یہ بات بھول گئے کہ نو سال کی کم سن بچی سے مباشرت ثابت کر کے وہ حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ فداہ امی وابی کے اعلیٰ ترین کریکٹر کو جسے '' وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (سورۃ القلم. آیۃ۴) '' کی آسمانی سند حاصل ہے، مخالفین اسلام میں ہیٹا اور محل اعتراض بنا رہے ہیں۔بدقسمتی سے مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک حضرت امام بخاریؒ کا بیان قرانی وحی سے کسی بھی طرح کم نہ تھا۔اس لئے وہ اس کے خلاف ایک بھی دلیل سننے کو تیار نہ تھے۔ پر کتنی عجیب بات ہے کہ بے خیالی میں سید صاحب موصوف خود بھی تاریخی دلائل وشواہد کی بنیاد پر بالکل وہی بات کہہ رہے تھے جو مولانا محمد علی صاحب نے پیش کی تھی۔لیکن میں نہ مانوں کی مقلدانہ ہٹ نے انہیں اصل حقیقت سے ہمکنار ہونے نہ دیا۔اور اوّلیت اور تحقیق کا سہرا حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ کے سر ہی بندھ گیا۔ بخاری شریف میں آمدہ روایت کی صحت یا عدم صحت کو قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم صرف مندرجہ ذیل تاریخی نکتے پر ہی غور کریں تو معاملہ خود بخود حل ہو جاتا ہے :

''امیر معاویہؓ کی خلافت کا آخری حصہ حضرت عائشہ ؓ کی زندگی کا آخری زمانہ ہے۔اس وقت ان کی عمر سڑسٹھ برس کی تھی۔'' (سیرت عائشہ۔ص۱۵۳)

''حضرت عائشہؓ بیوہ تھیں اور اس عالم میں انہوں نے زندگی کے چالیس مرحلے طے کئے۔'' (سیرت عائشہ۔ص۱۱۱)

مطلب یہ کہ حضرت نبی کریم ﷺ کی وفات (۱۱ھجری) کے وقت حضرت عائشہؓ ۲۷ برس کی تھیں۔ کاشانہ نبوت میں اُن کا قیام ۹ سال رہا، کیونکہ رخصتی سن ۲ ہجری میں ہوئی تھی۔اب معاملہ بنا کسی ایچا پیچی کے ایک دم صاف ہے کہ رخصتی کے وقت وہ کم سے کم ۱۸ سال کی بالغہ تھیں، نو سال کی کم سن بچی ہرگز نہ تھیں۔ یہ بات دوسرے تاریخی قرائن وشواہد سے بھی میل کھاتی ہے۔تاریخ ہمیں حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کا سن وفات ۷۳ ہجری بتاتی ہے۔اس وقت حضرت اسماءؓ کی عمر ۱۰۰ سال تھی۔حضرت اسماءؓ حضرت عائشہؓ سے دس سال بڑی تھیں۔سن ۲ ہجری میں آپ ۲۹ برس کی تھیں اس اعتبار سے بھی حضرت عائشہؓ دس سال کم یعنی ۱۹ سال کی تھیں۔پس اس میں منہ پھُلانے یا بگڑنے والی بالکل کوئی بات نہ تھی۔امام بخاریؒ نے بھی کب یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی فراہم کردہ ہر روایت قرآنی وحی کی مانند سو فیصد صحیح واٹل ہے۔اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس معاملہ میں بھی اب دُنیائے اسلام نے حضرت مولانا محمد علی کے نظریئے ہی کو صحیح تسلیم کرلیا ہے۔ثبوت کے لئے انٹرنیٹ کو دیکھا جاسکتا ہے۔

اب رہی اختلاف رائے والے مسئلے کی اصل حقیقت (جسے بدقسمتی سے معنوی تحریف سمجھ لیا گیا ہے) تو اُس کو قرآن پاک کے مشہور انگریزی مترجم مولانا حافظ غلام سرور صاحب نے نہایت عالمانہ ڈھنگ سے زیر بحث لایا ہے۔اور اصل صورت حال سب کے سامنے واشگاف کردی ہے۔مولانا غلام سرور اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''مولانا محمد علی صاحب نے سابقہ مترجموں کی بیسیوں غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔اور جہاں بھی انہوں نے اختلاف کیا ہے وہاں ان کا ترجمہ یا تو بالکل درست وصحیح ہے یا ان کے ترجمہ کی بنیاد و اساس عربی زبان کی مستند لُغات پر ہے۔ہمارے اس بیان سے کوئی یہ نتیجہ اخذ نہ کرلے کہ مولانا محمد علی نے (نعوذ باللہ) قرآنی الفاظ کو نئے معنی پہنادیئے ہیں۔اگر قاری عجلت اور جلد بازی سے کام نہ لے تو اسے معلوم ہوجائے گا کہ مولانا موصوف ایک بلند پایہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محقق بھی ہیں۔میں یہ بھی نہیں کہتا کہ مولانا موصوف کے بعض حواشی میں ندرت یا نیا پن موجود نہیں۔لیکن یہ کوئی نقص یا عیب والی بات نہیں۔کوئی بھی شخص جو قرآن پاک کی ترجمانی

میں کامل دیانتداری اور اخلاص سے کام لے۔اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تحقیق ومطالعہ کے نتائج کو کھل کر بیان کرے۔ترجمہ کی لکھائی اور چھپائی غیر معمولی طور پر دیدہ زیب اغلاط واسقام سے پاک ہے۔یہ ترجمہ شروع سے اخیر تک مولانا کی قرآن پاک کے تئیں والہانہ عقیدت اور فریفتگی کا غماز ہے۔اس عمدہ شاہکار کے لئے مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی مولانا محمد علی کے ہمیشہ رہین احسان رہیں گے۔''

(Translation of the Holy Qur'an, page xxxvii)

یہ تھی اختلاف رائے کی اصل حقیقت جس کو نہ معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا جاتا ہے۔مشہور عالم فاضل انگریز نومسلم ومترجم قرآن مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم نے سن ۱۹۳۶ء میں حضرت مولانا محمد علی کی شاہکار انگریزی تالیف "The Religion of Islam" پر ایک طویل تبصرہ شائع کیا تھا۔''ریلیجن آف اسلام'' میں اس اسلام کا وہی کامل نقشہ وبیان ہے جس کی تبلیغ وترویج مولانا محمد علی لاہوریؒ ساری عمر کرتے رہے۔اپنے عالمانہ تبصرے میں مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال مرحوم لکھتے ہیں :

''اسلام کی یہ توضیح وتشریح ایک ایسے بزرگ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے جو علوم قرآن وسنت کا متبحر اور جید عالم ہے۔جس کے قلب میں گذشتہ پانچ صدیوں کے اسلامی تنزل کی شرمندگی اور ندامت کا احساس ہے۔اور جس کی روح اسلام کی اُس ترقی اور تجدید کی اُمیدوں سے لبریز ہے جس کے آثار آج ہر طرف ہویدا ہیں۔

عبادات اور فرائض دینی کے متعلق احادیث وروایاتِ مذہبی سے بال برابر انحراف کئے بغیر فاضل مصنف نے ایک وسیع میدان پیش کیا ہے جس میں تبدیلیاں جائز ہیں،اور ہونی بھی چاہئیں۔کیونکہ ان معاملوں میں رسوم واعمال کی بنیاد نہ کسی قرآنی حکم پر مبنی ہے اور نہ ہی اقوال نبی کریم ﷺ پر۔ اور جونہی ایسے امور قومی ضروریات کے پورا کرنے سے عاجز آجائیں، ان میں تبدیلی لازمی امر ہے۔موجودہ دور میں ایسی کتاب کا منظر شہود پر آنا واقعی ایک نعمت مترقبہ ہے۔جب کہ بہت سے اسلامی ممالک میں ہم ایسے اشخاص پاتے ہیں، جو تجدید اور اصلاح کے جوش میں،اس علم سے محض بے بہرہ ہونے کی

وجہ سے نہایت فاش غلطیاں کر بیٹھتے ہیں۔۔۔۔ ہمیں کبھی کبھی مولانا موصوف کے اُن نتائج وآراء سے اتفاق نہیں بھی ہوتا، جوانہوں نے بعض فروعی امور کے متعلق ظاہر فرمائے ہیں۔لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ مولانا موصوف کے پیش کردہ دلائل واستدلال ہمیشہ ثقہ، پرزور اور ناقابل تردید ہوتے ہیں۔مولانا موصوف کا والہانہ خلوص و اخلاص کسی بھی سطح پر قاری کی آنکھوں کے سامنے سے اوجھل نہیں ہوتا۔مولانا موصوف کا قرآن سے عشق وانہماک ہی اس عظیم الشان تصنیف کے تمام اہم امور میں صحیح ودرست ہونے کی کافی ضمانت ہیں۔اس میں شک نہیں کہ ایسے لوگ بھی ہونگے جو مولانا موصوف کے اخذ کردہ حل وتعبیر کی نسبت مخالفت کا اظہار کریں گے۔لیکن یہ وہی لوگ ہونگے جن سے اسلام کو مستقبل میں کسی قسم کی امید نہیں ہے۔''

(''اسلامک کلچر''۔حیدرآباد دکن۔اکتوبر ۱۹۳۶ء)

ہمارے قارین یہ پڑھ کر ضرور حیران ہونگے کہ جہاں تک قرآن کریم کے اُن متداول تراجم اور تفاسیر کا تعلق ہے جن کو ہمارا عوامی حلقہ معتبر اور مستند جانتا ہے، اُنہی کے بارے میں خود مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی محققانہ رائے کچھ اس طرح ہے:

''حضرت شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند وغیرہ کے ترجمۂ قرآن اور حواشی بجائے خود کیسے ہی صحیح وقابل قدر ہوں۔مشککین اور مذبذبین کے لئے مفید نہیں۔''

(مکتوبات سلیمانی۔جلد2،حاشیہ 801ص32)

اس غیر متوقع رائے کی تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بھی یہ جملہ لکھا تھا :

''آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے ترجمے مشککین اور مذبذبین کیلئے مفید نہیں۔اس لئے حواشی بھی اُن کے لئے مفید نہیں۔''(ایضاً)

اب ہم اپنے اصل موضوع یعنی مفسر علاّم حضرت مولانا محمد علی صاحب کی مایۂ ناز شخصیت اور ان کی بے مثال قرآنی خدمات کی طرف آتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد علی لاہوریؒ

(شخصیت اور کارنامے)

لاہور کے مشہور و معروف اُردو اخبار ''انقلاب'' کے نامور مدیر مولانا عبدالمجید صاحب سالکؒ کا شمار برصغیر ہندو پاک کے اکابر علماء میں ہوتا ہے۔ یہ صاحب حضرت مولانا محمد علیؒ کے پڑوس میں رہتے تھے۔ لہٰذا دوسرے غیر احمدی علماء کی نسبت حضرت مولانا محمد علیؒ ذات وصفات سے زیادہ واقف تھے۔ جب 1951ء میں مولانا محمد علی کی وفات ہوئی تو سالکؔ صاحب نے اپنے اخبار میں ایک طویل ماتمی شذرہ لکھا، جس کو جماعت احمدیہ لاہور کے آرگن ''پیغام صلح'' نے اپنے ''مولانا محمد علی نمبر'' میں شامل کیا۔ مولانا سالکؔ نے حضرت مولانا محمد علی کی مایۂ افتخار شخصیت اور ہمہ پہلو خدماتِ دینیہ کو کچھ اس انداز سے بیان کیا ہے کہ مشہور محاورہ ''سمندر کو کوزہ میں بند کر دینا''، خود بخود ذہن میں مستحضر ہو جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ مولانا سالکؔ صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

''جب میں لاہور میں ''زمیندار'' کا ایڈیٹر مقرر ہوا اس زمانے تک مولوی ظفر علی خان اور ڈاکٹر اقبال کے مولوی محمد علی صاحب، خواجہ کمال الدین، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، ڈاکٹر سید محمد حسین اور شیخ رحمت اللہ(۱) سے دوستانہ تعلقات تھے۔ لیکن ان بزرگوں سے میری ملاقات گاہے ماہے ہوا کرتی تھی۔ ''انقلاب'' جاری ہونے کے بعد مولانا محمد علی صاحب سے اکثر ملاقاتیں ہوتیں۔ مولانا احمدیہ بلڈنگس میں مسجد سے متصل مکان میں رہتے تھے۔ اور میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ مولانا مجھ پر بے حد شفقت فرماتے۔ مولانا محمد علی حضرت مرزا صاحب کی صحبت سے نہایت سچے اور پکے مسلمان بن گئے۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کے قلب و دماغ میں مذہب مقدس اسلام کی عظمت کچھ اس طرح جاگزیں ہوئی کہ آپ نے اپنی پوری زندگی اس کی تبلیغ کے

---

(۱)۔ یہ سارے حضرات احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے بانی ممبر ہیں۔ (خورشید)

لئے وقف کردی۔ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدمتِ دین میں بسر ہوا۔ قرآن مجید کے انگریزی ترجمے کے علاوہ انہوں نے دینی مسائل پر بے شمار کتابیں لکھیں۔جن میں سے میرے نزدیک بہترین کتاب ''ریلیجن آف اسلام'' ہے جس کو پڑھنے کے بعد انگریزی داں شخص دین کے متعلق اس قدر مفصل معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ جو فارغ التحصیل مولویوں کو بھی نصیب نہیں ہوتیں۔

کوئی پندرہ سال سے مولوی محمد علی صاحب مسلم ٹاؤن میں رہتے تھے۔ جہاں میرا غریب خانہ بھی ہے۔اس لئے مجلسوں اور تقریبوں میں ان سے اکثر ملاقات ہوتی تھی اوران کی بزرگی اور تقدس کے باوجود میں ان کی خدمت میں خاصا بے تکلف تھا۔ بلاشبہ وہ احمدی تھے لیکن دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت مخلصانہ وبرادرانہ تھے ۔ ایک اس لئے کہ وہ احمدیوں کی اُس شاخ کے امیر تھے۔جس کے عقائد میں تشدد نہیں، دوسرے اس لئے کہ ان کی طبیعت اصلاً صلح پسند تھی۔ وہ مسلمانوں کی تمام تحریکات میں ہمدردانہ حصہ لیتے تھے۔ کسی کی تکفیر کے روادار نہ تھے کیونکہ ان کے نزدیک تکفیر اور تبلیغ میں تضاد تھا۔

وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے مغرب کو بھی اسلام کا پیغام دیتے تھے۔اور حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر اعتبار سے اس پیغام کے پہنچانے کی اہلیت رکھتے تھے وہ صرف عالم دین نہ تھے بلکہ ایک عالی پایہ مفسر اور مجتہد بھی تھے۔اعلیٰ درجے کے انگریزی داں تھے۔اور مغربیوں کے ذہن کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اسلام کو مغربی تعلیم یافتہ طبقوں اور خود مغربیوں تک ایسے رنگ میں پہنچایا کہ وہ بے اختیار اس مذہب کی عظمت کے قائل ہو گئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ممالک مغرب کے صدہا طالبانِ حق مولانا محمد علی کے مقالات اور کتابوں کو پڑھ کر مسلمان ہوئے۔اور یہ مولانا محمد علی ہی کی مساعی کی برکت ہے کہ آج ممالکِ مغرب میں اسلام کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ اور شاذ ونادر ہی کسی شخص کو اسلام کی مخالفت کی جرأت ہوتی ہے۔اسلام کی بے لوث خدمت اور مدت العمر انہماک یقیناً مولانا محمد علی کی مغفرت کا باعث ہوگا۔ کیونکہ

اللہ تعالیٰ اپنے دین کے مخلص خادموں کی سعی وجہد کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔

اس میں شک نہیں کہ عقائد میں اُن کے اور عام مسلمانوں کے درمیان تھوڑا سا فرق تھا لیکن وہ فرق اتنا سنگین ہرگز نہ تھا کہ مسلمان ان کی خدماتِ دینی کو فراموش کر دیں اور ان کی قدر نہ کریں۔'' (پیغام صلح۔26 دسمبر 1951ء)

مشہور صحافی، عالم دین اور مفسر قرآن، مولانا عبدالماجد دریا آبادی مرحوم لکھتے ہیں:

''مولانا محمد علی صاحب نے قرآن کا انگریزی ترجمہ کر کے اسلام کی جو مہتمم بالشان خدمت سرانجام دی ہے۔ اس کا اعتراف نہ کرنا سورج کی روشنی سے انکار کرنا ہے۔ اس ترجمہ کی بدولت نہ صرف ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام کے دامن میں پناہ لی، بلکہ ہزاروں مسلمان بھی اسلام کے زیادہ قریب آ گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے۔ میں نہایت مسرت سے اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ترجمہ ان چند کتابوں میں سے ہے جو چودہ پندرہ سال پہلے، جب میں ظلمتوں اور دہریت کی گہرائیوں میں بھٹک رہا تھا، میرے لئے شمع ہدایت بن کر آئیں۔ اور مجھے اسلام کا سیدھا راستہ سمجھایا۔ کامریڈ والے محمد علی (جوہر) مرحوم بھی اس ترجمہ کے بہت شائق تھے اور ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔''

(اخبار ''سچ'' لکھنؤ۔25 جون 1934)

قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ وتفسیر اور اُردو تفسیر ''بیان القرآن'' شائع کرنے سے پہلے

جب سن ۱۹۱۴ء میں مسئلہ تکفیر کو لیکر جماعت احمدیہ میں شدید اختلاف رونما ہوا۔ اور بسیار کوششوں کے بعد بھی سلجھائے نہ سلجھا تو حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کو مجبوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر قادیان سے خالی ہاتھ لاہور آنا پڑا۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا مندرجہ ذیل یادگار تاریخی بیان نہایت کارآمد ہے۔ کیوں کہ اسی تاریخی شہادت کو نظر انداز کر کے ہمارے مخالفین اصل واقعات کو بگاڑ کر کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں:

''ایک عرصہ سے اس جماعت میں مسئلہ تکفیر کی بنا پر دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک گروہ کا یہ اعتقاد تھا کہ غیر احمدی مسلمان ہیں گو وہ مرزا صاحب کے دعوؤں پر ایمان نہ لائیں۔

لیکن دوسرا گروہ صاف صاف کہتا تھا کہ جولوگ مرزا صاحب کے دعوؤں پر ایمان نہ لائیں وہ قطعی کافر ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آخری جماعت کے رئیس صاحبزادہ بشیرالدین محمود ہیں۔ اس گروہ نے انہیں اب خلیفہ قرار دیا ہے۔ مگر پہلا گروہ تسلیم نہیں کرتا۔ مولوی محمد علی صاحب ایم۔اے۔ نے اس بارے میں جو تحریر شائع کی ہے اور جس عجیب وغریب جرأت اور دلاوری کے ساتھ قادیان میں رہ کر اظہار رائے کیا ہے۔ جہاں پہلے گروہ کے رؤسا ہیں وہ فی الحقیقت ایک ایسا واقعہ ہے جو ہمیشہ اس سال کا یادگار واقعہ سمجھا جائے گا۔'' (اخبار الہلال۔ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۴ء)

لاہور آ کر مولانا محمد علی صاحب نے احمدیہ بلڈنگس میں ایک نیا مرکز احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کے نام سے قائم کیا۔ یہ وہی مبارک مقام ہے جہاں بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحب نے اپنے آخری ایام میں متعدد لیکچر دیئے، یہیں وفات پا کر مالک حقیقی سے جا ملے اور یہیں علامہ حکیم نورالدین مرحوم نے نمازیں بھی پڑھائیں۔ لاہور کے اس متبرک مقام کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہیں درس قرآن کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ درس قرآن کا یہ مبارک سلسلہ خود مولانا محمد علی صاحب نے شروع کیا۔ مولانا موصوف کے عالمانہ درس کو سننے کے لئے مختلف مکاتب اور حلقہ خیال کے پڑھے لکھے مسلمان بڑی تعداد میں حاضر ہوتے تھے۔ ان سامعین میں مولانا ظفر علی خان صاحب اور علامہ اقبال مرحوم جیسے مشاہیر بھی شامل تھے۔ عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ مولانا محمد علی کا درس سُن کر علامہ اقبال پر اکثر رقت طاری ہو جاتی اور وہ ڈھاریں مار کر روتے تھے۔(۱) قرآن پاک کی انگریزی تفسیر اور اُردو تفسیر شائع

---

(۱) اس زمانہ کے ایک عینی شاہد جناب چوہدری ظہور احمد صاحب مرحوم، جو انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی وابستہ رہ چکے ہیں، لکھتے ہیں:۔

''میں نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے ایک سکول میں اور پھر اسلامیہ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ اس عرصہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں بڑی پابندی سے شرکت کرتا۔ جلسہ کے پروگرام میں حضرت مولانا محمد علی صاحب مرحوم ومغفور کا لیکچر ہوا کرتا تھا۔ ان کا اسلوب یہ تھا کہ وہ قرآن مجید کی چند آیات تلاوت فرماتے اس کی تشریح اور اس کے بعد حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور مکی اور مدنی دَور کے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے رہنمائی کا طریق بنائے۔ اس وقت بڑے بڑے سجادہ نشین اور عالم وفاضل دم بخود ہو جاتے۔ اور ڈاکٹر سر محمد (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرنے سے پہلے حضرت مولانا محمد علی نے اپنے درسی نوٹوں کو 'نکات قرآن' کے نام سے مختلف جلدوں میں شائع فرمایا۔ 'نکات قرآن' کی پہلی جلد 1915ء میں شائع ہوئی۔ چھ مختصر جلدوں کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔ پہلی جلد شائع ہوئی، تو سبھی روشن دماغ اور غیر متعصب علماء نے اِسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس کی غیر معمولی شان وافادیت کے پیش نظر بعض علماء نے اپنی گرہ سے اس کی کاپیاں خرید کر مسجد کے اُن اماموں میں مفت تقسیم کیں جو خود خریدنے کی استعداد نہ رکھتے تھے۔ لاہور کا ایک نامور قدیم اخبار ''زمیندار'' بھی تھا۔ اس کو مولانا ظفر علی خان صاحب کے والد ماجد مولوی سراج الدین خان مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا۔ اس زمانہ میں مولانا عبداللہ العمادی اس اخبار کے ایڈیٹر اور مولانا ظفر علی خان مالک و چیف ایڈیٹر تھے۔ مولانا العمادی نہایت اعلیٰ پایہ کے عالم وفاضل تھے پہلے ''البیان'' اور کچھ عرصہ دارالعلوم ندوہ کے عربی رسالہ ''الندوۃ'' کی ادارت پر بھی مامور تھے۔ ''نکات قرآن'' پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔

''جناب مولوی محمد علی صاحب ایم، اے ان عزیز الوجود بزرگوں میں سے ہیں۔ جن کی عالمانہ زندگی کا کوئی لمحہ خدمتِ اسلام سے خالی نہیں رہتا۔ روزانہ قران کریم کا درس دیتے ہیں۔ اور ہر آیت کی تفسیر میں حقائق ومعارف کے دریا بہا دیتے ہیں۔ حال ہی میں اس درس مقدس کے بعض اہم اقتباسات انہوں نے خود ہی قلمبند کر کے شائع فرمائے ہیں۔ جنمیں اکثر آیات جز واول اور کسی قدر جز وثانی کی تفسیر ہے۔ اور اس خوبی کی تفسیر کی ہے کہ شاید اردو زبان کا خزانہ ایسے تابناک جواہر ریزے بڑی مشکلوں سے بھی نہ نکال سکے۔۔۔۔۔ فاضل مفسّر نے جن اصول پر یہ تفسیر لکھی ہے۔ ان کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں کہ زیادہ تر قرآن کریم کو قرآن کریم ہی کے دوسرے مقامات سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ یا صحابہ سے جو معنے مروی ہیں ان کو مقدم مانا ہے۔ اور اپنی رائے کو لغت کے ماتحت رکھا ہے۔ یہ نہایت پاکیزہ اصول ہیں اور یہ مفید

(بقیہ حاشیہ) اقبال کو تو میں نے کئی مرتبہ آبدیدہ ہو کر ڈھاریں مارتے ہوئے دیکھا۔ تقریر کے الفاظ اور طرز ادائیگی میں سادگی کے باوجود سامعین میں اس قدر جذب کی کیفیت اور تاثیر پیدا کر دیتی کہ کسی بڑے شاعر اور ادیب کو بھی یہ مرتبہ نصیب نہ ہوا اور یہ توجہ کسی اور ادیب وشاعر یا لیکچرار میں نظر نہیں آتی تھی۔'' (پیغام صلح۔ جلد 78۔ شمارہ 1) (خورشید)

ترین تفسیر واقع میں انہیں اصول پر ہے۔'' (اخبار''زمیندار''15/اپریل1915ء)

چونکہ چیف ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان تھے، لہٰذا ''اخبار زمیندار'' کا یہ تبصرہ انکی طرف بھی منسوب کیا گیا ہے۔ ایک ایسا ہی تبصرہ میرٹھ کے ماہنامہ ''اسوۂ حسنہ'' میں چھپا تھا۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:۔

''مولوی محمد علی ایم اے، ایل ایل بی سابق ایڈیٹر ریویو آف ریلیجنز قادیان کی مفید تفسیر کا دوسرا حصہ ''نکات القرآن'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔۔۔مولوی صاحب ممدوح کی عمر کا بڑا حصہ قرآن حکیم میں غور وتدبر کرنے اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کی تردید میں صرف ہوا ہے۔اسلئے اگر ان کے قلم سے نکلی ہوئی تفسیر کی تعریف میں یہ کہا جائے کہ وہ موجودہ زمانہ کی بہترین مذہبی تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے تو جائے تعجب نہیں۔ہم نے اس تفسیر کے اکثر مقامات کو غور سے پڑھا ہے اور پڑھکر بہت محظوظ ہوئے ۔واقعی امر یہ ہے کہ مولوی صاحب نے ضرورتِ وقتیہ کو مدنظر رکھ کر قرآن حکیم کے حقائق عالیہ پر نہایت خوبی سے روشنی ڈالی ہے۔اور دریا کو کوزہ میں بند کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غیر ضروری تطویل اور مخل مقصود اختصار، یہ دو عیب عموماً ہماری تفسیروں میں پائے جاتے ہیں۔لیکن نکات القرآن ایک حد تک ان سے پاک ہے ۔ اس تفسیر میں مناسب موقع اُن شکوک وشبہات کے بھی شافی جواب دیئے گئے ہیں جو جدید تعلیم یا صحبت کے اثر سے ناواقف مسلمانوں کی طبیعتوں میں پیدا ہوتے یا اقوام غیر کی جانب سے کئے جاتے ہیں۔اس لحاظ سے یہ تفسیر ان لوگوں کے لئے بھی کارآمد ہے جو تبلیغ اسلام میں کچھ دلچسپی لیتے ہیں۔ علےٰ ہذا جو لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں کہ قرآن مجید کی تعلیمات محض روحانی دائرہ تک محدود ہیں اور معاشرتی اور تمدنی یا سیاسی امور سے انہیں کوئی تعلق نہیں۔اس تفسیر کے مطالعہ سے ان کی غلط فہمیاں بھی بہت کچھ رفع ہوسکتی ہیں۔ نکات القرآن کی زبان سلیس اور آسان ہے ۔ اور اس میں مولویانہ الجھن نہیں ہے ۔جس سے تھوڑی قابلیت رکھنے والے کو مطلب سمجھنے میں دِقّت ہو۔'' (ماہنامہ ''اسوۂ حسنہ'' میرٹھ، جولائی1916ء)

حضرت مولانا محمد علیؒ کے
انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن اور اُردو تفسیر
'بیان القرآن' کا شاندار استقبال

حضرت مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیر بڑی آب وتاب کے ساتھ 1917ء میں لندن سے شائع ہوئی۔ مشرق اور مغرب کے تمام علمی اور ادبی حلقوں نے اس کا پرُ جوش استقبال کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مخالفین اسلام کے بہت سارے شکوک اور اعتراضات کا خاتمہ ہونے لگا۔ مغرب کے نامور تاریخ نویس اور نقاد ایچ، جی، ویلس (H.G.Wells) نے 1920ء میں اپنی مشہور زمانہ تصنیف "The Outline of History" میں مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ القرآن کی تیسری سورت کا 16 واں رکوع نقل کرتے ہوئے یہ الفاظ تحریر کیے:۔

''یہ قرآن شریف کی چند شاندار آیتیں ہیں جن کو ہم نے اُس "Orthodox" (راسخ العقیدہ ومستند) ترجمہ سے نقل کیا ہے جس کو حال ہی میں مولوی محمد علی صاحب نے شائع کیا ہے''

(The outline of History, H.G. Wells,1920, P.267)

تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش اور یادگار واقعہ

اخبار پیغام صلح لاہور کے 5 اگست 1970 کے شمارے میں احمدی درس قرآن کی طویل تاریخ چھپی ہے۔ جس میں جماعت کے جنرل سیکریٹری جناب مرزا معصوم بیگ۔ ایم۔ اے۔ نے تاریخ عالم کے حوالے سے ایک غیر معمولی انکشاف درج کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

''مغربی لوگ اگرچہ عقیدتاً مسلمان نہیں ہیں۔ لیکن عملاً وہ قرآن کریم کے آگے سر جھکا چکے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے موقعہ پر۔۔۔ ایک ایسا وقت آیا کہ امریکہ کو خدشہ

پیدا ہوگیا کہ اس کا وجود صفحہ ہستی سے نابود ہوجائے گا۔اس وقت یہ تجویز ہوئی کہ زمین کے نیچے ایک شہر آباد کیا جائے۔ جس میں دُنیا کی تمام نادراشیاء بحفاظت رکھی جائیں۔تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں جب چاہیں زمین کھود کران اشیاء کوحاصل کرسکیں۔اورجن اشیاء کو وہاں رکھنے کی تجویز ہوئی ، ان میں بائبل اورقرآن بھی تھا۔ اور ہماری انجمن کوچٹھی آئی کہ حضرت مولانا محمدعلی صاحبؒ کا ترجمۃ القرآن اس غرض کے لئے بھیجا جائے اوروہ ترجمہ ہماری طرف سے ارسال کردیا گیا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت مولانا مرحوم کے ترجمہ کوکیا خصوصیت حاصل ہے۔''

ہم یہاں وہ بے شمار آراء، تجزیئے اور تبصرے نقل تونہیں کرسکتے جواس ترجمہ وتفسیر کے بارے میں دنیا کے مختلف اخبارات، رسالہ جات اور کتب وغیرہ میں چھپتے رہے۔کیوں کہ وہ اتنے زیادہ ہیں کہ اگر اکٹھا کردیئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔بس نمونۃً کچھ اقتباسات ہدیہ خدمت ہیں، ملاحظہ فرمائیں :

متحدہ ہندوستان کے مشہور عالم فاضل مسلم لیڈر مولانا محمدعلی جوہرؔ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں اپنی نظر بندی کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قریباً یہی وہ وقت تھا جب کہ ایک مشفق دوست نے ایک ایسا تحفہ ہمیں بھیجا(۱) جس سے بڑھ کراور کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ یہ قرآن کریم کا نسخہ تھا جونہایت اعلیٰ درجہ پر چھپوایا گیا ہے۔اوراس کے ساتھ انگریزی زبان میں نہایت صحیح ترجمہ اورمعلومات سے بھرے ہوئے نوٹ درج ہیں۔جوکہ قرآن کریم کی تفاسیر اور صحف یہود ونصاریٰ کے گہرے مطالعہ پرمبنی ہیں۔یہ میرے فاضل ہمنام مولانا محمدعلی صاحب لاہوری کا کارنامہ ہے۔ جوایک بہت بڑی مذہبی جماعت کے سربراہ اورلیڈر ہیں۔اوراس جماعت کے کچھ ممبرانگلستان میں تبلیغ اسلام کا کام کررہے ہیں۔اورانہوں نے مسجد ووکنگ میں مشن قائم کررکھا ہے۔ یہ ترجمہ اوراس کے حواشی اس زہر کا نہایت ضروری تریاق ہیں جو سیلؔ۔راڈویلؔ۔اور پامرؔ جیسے انگریزی مترجمین کے فٹ نوٹوں میں پایا جاتا ہے۔اوراس

(۱)۔یہ تحفہ جماعت احمدیہ لاہور کے نامور ممبر ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے بھیجا تھا۔(خورشید)

ذہنی کیفیت میں جس میں میں اس وقت مبتلا تھا، میں نے اس دوست کو جس نے قرآن کریم کے یہ نسخے بھیجے تھے یہ لکھا کہ میرے لئے اس سے بڑھ کر کوئی چیز خوش کُن نہیں ہوسکتی کہ جونہی میں ان قیود سے، جو نظر بندی کی حالت میں مجھ پر عائد ہیں، آزاد ہوجاؤں۔ یورپ چلا جاؤں اور ان لوگوں کے، جنکے دماغ جنگ کے اثر سے پاگل ہو چکے ہیں۔ ہر ایک پارک سے اور ہر بازار سے اس پاک مذہب کی تلقین کروں۔ جو اِن جنگ کرنے والی قوموں کے شوروغل کو اسلام کے متحد کرنے والے امن وامان میں خاموش کرواسکتا ہے۔'' (بحوالہ۔مجاہد کبیر۔ص ۱۴۸)

مولانا محمد علی جوہرؔ معمولی انسان نہ تھے۔ وہ انگریزی کے ساتھ ساتھ عربی کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کی biblography (کتابیات) میں مولانا جوہرؔ کو بطور اتھارٹی پیش کیا ہے۔ مولانا جوہرؔ جیسے نابغہ روزگار اور مستند عالم دین نے جو رائے حضرت مولانا محمد علی لاہوری کے ترجمۃ القرآن کے متعلق ظاہر کی ہے۔ اس سے بہتر الفاظ میں اس شاندار تفسیر کو سراہا نہیں جاسکتا۔ پر تعصب کا برا ہو، متعصب آنکھ کو دوسروں کی اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کتمانِ حق کا ارتکاب کر ہی لیتی ہے۔ دارالعلوم ندوۃ کے سربراہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کا تعصب میں ڈوبا ہوا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں :

''لاہور کی جماعت احمدیہ نے تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر تیار کرنے کے کام سے خاصی دلچسپی لی۔ ان کے کام کو ہندو بیرون ہند کے تعلیمیافتہ طبقہ میں انگریزی زبان میں ہونے اور اچھے انداز میں پیش کئے جانے کی وجہ سے خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان مصنفین میں سرفہرست خود جماعت احمدیہ لاہور کے بانی وامیر مولوی محمد علی لاہوری ہیں۔ جنہوں نے انگریزی زبان میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اس کو ہاتھوں ہاتھ کیا۔ ان کے قلم سے جو تشریحات وحواشی نکلے ان سے ایسے بہت سے افراد متاثر ہوئے جن کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ براہ راست اور گہرا نہ تھا۔ اور جو جدید نظریات وتحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مرعوب تھے۔ اور جن کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی تشریحات کی تلاش تھی جو ان کی علمی ومذہبی پیاس

بجھا سکے۔ان کے تفسیری نوٹس میں معجزات اور غیبی حقائق کو طبعی اشیاء اور عام قانون قدرت کے تابع بنانے کا رنگ مبالغہ آمیزی وانتہا پسندی کی حد تک غالب ہے۔۔۔'' (اسلامیات اور مغربی مستشرقین ومسلمان مصنفین ۔ص۳۲و۳۳)

مولانا محمد علی جوہر جیسے جید عالم دین کی ماہرانہ اور عالمانہ رائے کے سامنے مولانا علی میاں ندوی کے تعصب سے بھرے اس بیان کی کیا وقعت ہوسکتی ہے؟ کیا مولانا جوہر کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ :

''ان کا اسلام اور علوم اسلام کا مطالعہ براہ راست اور گہرا نہ تھا۔اور وہ جدید نظریات وتحقیقات اور سائنس کی ترقی سے مرعوب تھے۔اور ان کو ایسی کتابوں اور اسلام کی ایسی تشریحات کی تلاش تھی جو ان کی علمی ومذہبی پیاس بجھا سکے۔''

مولانا علی میاں ندوی کے چہیتے مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی نے جب پہلی بار اپنی اردو تفسیر شائع کی تو اس میں مولانا محمد علی لاہوری کے آگے فقط اتنا لکھ دیا تھا ''ترجمہ کی حد تک قابل قدر ہے۔'' لیکن جب اسی تفسیر کو نظر ثانی کے بعد تاج کمپنی کے حوالے کیا گیا تو وہاں یہ جملہ بالتخصیص لکھ دیا گیا :

''مغربیت سے متاثر گروہ کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔''

مولانا محمد علی جوہر کی دلی تمنا

جب مولانا محمد علی جوہر صاحب راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت کرنے لندن جارہے تھے ، تو جانے سے پہلے مولانا محمد علی لاہوری سے ملاقات کے لئے خاص طور پر لاہور پہنچے۔اور دوران گفتگو مولانا محمد علی لاہوری سے کہا : مولانا اگر وہاں کے لوگ مجھ سے یہ سوال کریں کہ کیا قرآن کا انگریزی ترجمہ کرنے والے آپ ہی ہیں؟ تو کیا میں ہاں کرلیا کروں؟ اس پر حضرت مولانا محمد علی نے ہنستے ہوئے فرمایا : اس میں کیا شک کہ یہ ترجمہ محمد علی نے ہی کیا ہے۔

(ماخوذ از اخبار پیغام صلح لاہور۔مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

اخبار ''کویسٹ'' لنڈن :

''بے شک یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس پر ایک عالم فاضل انسان فخر کرسکتا ہے۔''

مشہور مصنف اور دانشور ایس۔ایچ۔لیڈر (انگلستان) :

''آپ کی مذہبی کتاب کے اتنے اعلیٰ درجہ پر اور خوبصورتی کے ساتھ چھپنے پر میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔اس کے اندر جو نور اور علم وفضل بھرا ہوا ہے اس کو دیکھا جائے تو ہمارا دل آپ کی اتنی بڑی عزت کے لئے تشکّر کے جذبات سے بھر جاتا ہے۔یہ ترجمہ دُنیا کی مذہبی تاریخ میں ایک نئے دور کی ابتدا ہے۔''

اخبار ''مدراس میل'' بھارت :

''مولانا محمد علی کا نام ہی اس ترجمہ کی عمدگی اور درستگی کا ضامن ہے۔شاید ہی کوئی انگریزی ترجمہ اتنے اعلیٰ پایہ کا ہو۔''

اخبار ''ہندو ''مدراس :

''اس کے مصنف صحیح اور قابل اعتماد ترجمہ کے لئے مشہور ہیں۔کتاب کے مقدمہ میں اور تشریحی نوٹوں میں علم کا ایک خزانہ موجود ہے۔''

اخبار '' یونائیٹڈ انڈیا '' دہلی :

''نسل انسانی نے جواب تک تصنیف وتالیف کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں ، ان میں مولانا محمد علی کا انگریزی ترجمہ قرآن ایک نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔''

ہندوستان کی تحریک آزادی میں

مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمہ قران کا رول

تحریک آزادی کے سلسلہ میں بھارت کے پہلے پرائم منسٹر پنڈت جواہر لعل نہرو کو متعدد بار جیل جانا پڑا۔اُن کے وہ سارے مکتوب شائع ہو چکے ہیں، جوانہوں نے مختلف جیلوں میں وقتاً فوقتاً افسران جیل کو بھیجے تھے۔ایک خط میں انہوں نے مطالعہ کے لئے کتابوں کی لمبی لسٹ بھجوائی ہے۔ اس لسٹ میں سرفہرست مولانا محمد علی صاحب کی انگریزی تفسیر قرآن ہی ہے۔

ایک بار گاندھی جی نے ''جہاد'' کے بارے میں کوئی ناروابات لکھ دی۔جس پر حضرت مولانا محمد علی نے اپنے دہلی کے مبلغ مولانا شیخ عبدالحق صاحب کے ہاتھ اپنی انگریزی تفسیر گاندھی جی کو بھجوائی۔مولانا شیخ عبدالحق صاحب کا بیان ہے:۔

''جب مجھے گاندھی جی سے دوبارہ ملاقات کا موقعہ ملا تو یقین مانیئے انہوں نے مولانا محمد علی کا نام سنتے ہی بڑی خوشی کا اظہار کیا۔اور بڑی دیر تک مولانا محمد علی کی تعریف کرتے رہے ۔اور مجھے مخاطب کر کے فرمایا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام حضرت محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے صحابہ کے تئیں عزت وتکریم کا جو جذبہ میرے اندر پیدا ہوا ہے ۔ وہ ''ڈاکٹر'' صاحب کی کتابوں کو پڑھ کر ہی ہوا ہے۔میں حیران ہوا کہ وہ کون سے ڈاکٹر صاحب ہیں جن کا مہاتما جی پر اتنا گہرا اثر ہے۔جب میں نے باتوں باتوں میں ''ڈاکٹر'' صاحب کے بارے میں دریافت کیا تو گاندھی جی نے فرمایا کہ میری مراد مولانا محمد علی لاہوری ہیں۔'' (پیغام صلح 25/اکتوبر 1978)

اس بات کا ثبوت گاندھی جی کی تحریرات میں بھی ملتا ہے۔انہوں نے ہر جگہ مولانا محمد علی کے نام کے آگے "Doctor" ہی لکھا ہے۔''ڈاکٹر'' انگریزی میں ''علامہ'' کو کہتے ہیں۔کتنا عجیب اتفاق ہے کہ جب ہم نے مولانا محمد علی کی انگریزی تصنیفات کو مسلمانوں کے قدیم ترین اور معتبر ترین دینی ادارے ''الازہر الشریف'' مصر کے جید علماء کے پاس اس غرض سے بھیجا کہ وہ اُن مقامات کی نشاندہی کر دیں، جو اُن کے خیال میں غیر اسلامی ہیں، تاکہ عربی میں منتقل کرنے سے پہلے ان عبارتوں کو حذف کر دیا جائے۔پورے ایک سال کے بعد جو سرٹیفکیٹ ازہر کے

علماء نے جاری کیا، اس میں یہی لکھا کہ مولانا محمد علی کی ''جملہ انگریزی کتب انگریزی خوان طبقہ کے لئے نہایت کارآمد ہیں۔ اور یہ بھی کہ ہمیں ان کتابوں میں کوئی بات ایسی نظر نہ آئی جس کو اسلامی معتقدات کے منافی قرار دیا جاسکے''۔ جامع الازہر کے سربراہ حضرت علامہ شیخ محمد طنطاویؒ نے ہمارے نمائندے کو یہاں تک کہہ دیا کہ اس عظیم المرتبت عالم دین کے لئے صرف مولانا محمد علی کہنا یا لکھنا کافی نہیں۔ ان کے نام کے آگے ''علامہ'' جوڑ دیا جائے۔ کیونکہ وہ اس لفظ کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور جب ہم نے علامہ طنطاوی سے ''ریلیجن آف اسلام'' کے عربی ترجمہ ''الدین الاسلامی'' کے لئے تقریظ لکھنے کی درخواست کی۔ تو انہوں نے خوشی خوشی اس درخواست کو قبول کیا۔ اور خود اپنے قلم سے ایک شاندار تقریظ لکھ کر دے دی۔ اس تقریظ میں علامہ طنطاوی نے اپنے ہاتھ سے مولانا محمد علی کے آگے ''علامہ'' کا لفظ ایزاد کیا۔ **فَالْحَمْدُ لِلّٰہ عَلٰی ذالِک.** اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مولانا محمد علی صاحب کی لگ بھگ سبھی انگریزی تصنیفات کے عربی تراجم ''الازہر کے سرٹیفکیٹ'' کے ساتھ مصر ہی سے شائع ہو چکے ہیں۔ اب انکو عرب کی جملہ لائبریریوں میں بھیجا جارہا ہے۔

سن ۱۴۲۷ھ میں (یعنی لگ بھگ دو دہائیاں پہلے) اگشیخ الازہر جناب ڈاکٹر محمد سید طنطاوی نے جامع الازہر کے آفیشل آرگن ''الازہر'' کے ذی القعدۃ کے شمارے میں ویٹکن کے پوپ کے جہاد سے متعلق اعتراضات کا مدلل جواب لکھا، جس کو تین زبانوں (عربی، انگریزی اور فرنچ) میں شائع کیا گیا۔ قارین حیران ہونگے کے دُنیائے اسلام کے اتنے بڑے اور جید عالم دین نے اپنے بیان کی تائید میں حضرت مولانا محمد علی لاہوری ہی کو پیش کیا ہے۔ اصل عربی عبارت یوں ہے :

''وقدصرح بذلک منذاکثر من سبعین سنة العلامة مولانا محمدعلی فی کتابه القیم''الدین الاسلامی'' فقال فی ص ۴۱۳ :

''هناک سوء فهم شدید شائع لمعنی فریضة الجهاد فی الاسلام یرجع الی افتراض ان کلمة الجهاد مرادفة لکلمة الحرب ؛ فحتی کبارالباحثین فی اوربا لم یبذلواجهداً یذکرفی الرجوع الی ای من معاجم اللغة العربیة او القرآن الکریم من اجل معرفة المعنی الحقیقی للکلمة.وقداصبح سوء الفهم ذاک شائعاً...الجهاد والمجاهدة یعنیان استفراغ الجهود...الجهاد ثلاثة اقسام : الاول .مجاهدة العدو

الظاهر. الثانی .مجاهدة الشیطان. الثالث. مجاهدة النفس..." (مجله "الازهر" .ص ۳۴ تا ۳۵) ترجمہ۔ستر سال قبل علامہ مولانا محمد علی صاحب نے اپنی مایہ ناز تالیف ''الدین الاسلامی'' کے صفحہ ۴۱۳ پر جہاد کی اصل حقیقت یوں بیان فرمائی ہے: ''جہاد کے متعلق بہت بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ لفظ جہاد کو ''حرب'' (جنگ) کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔یورپ کے بڑے بڑے محققین نے بھی عربی زبان کی لغت کو دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور نہ ہی کبھی اس لفظ کے اصل معنی معلوم کرنے کے لئے قرآن کریم کو کھول کر دیکھا۔نتیجہ یہ کہ یہ غلط فہمی عام ہوگئی ہے۔۔۔**اَلْجِهَاد** یا **اَلْمُجَاهَدَة** کے معنی ہیں دشمن کے دفاع کے لئے طاقت صرف کرنا۔۔جہاد یعنی جدوجہد کا عمل میں لانا تین قسم پر مشتمل ہے : ایک۔کھلے دشمن کے کے خلاف، دوسرا۔شیطان کے خلاف اور تیسرا۔نفس کے خلاف۔۔۔''

جن دنوں مرارجی ڈیسائی صاحب ہندوستان کے پرائم منسٹر تھے، کسی تقریب میں جماعتِ اسلامی والوں نے انہیں علامہ یوسف علی کی انگریزی تفسیر قرآن تحفۃً پیش کی۔مرارجی نے اُسے شکریہ کے ساتھ لے تو لیا لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ میرے پاس اس سے عمدہ تفسیر مولانا محمد علی لاہوری کی پہلے سے موجود ہے۔یہ بات اس وقت پریس میں بھی آئی تھی۔امریکہ سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ ''بشارات احمدیہ'' نے اپنے دسمبر 2012ء کے شمارہ میں دہلی کے مشہور اُردو جریدے ''صحافت'' مورخہ ۱۶/جولائی 2011ء کے حوالہ سے ایک غیر معمولی تاریخی انکشاف نقل کیا ہے لکھا ہے:۔

''گاندھی جی کے روزانہ معمول میں گیتا، قرآن اور بائبل کی تلاوت شامل تھی، ہر صبح مولانا محمد علی (لاہوری) کے ترجمۃ القرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناتے..... حالانکہ محمد مارماڈیوک پکتھال، عبداللہ یوسف علی اور عبدالماجد دریابادی کے انگریزی تراجم قرآن بالترتیب ,1930ء، 1934ء اور 1941ء میں منظر عام پر آچکے تھے۔لیکن گاندھی جی صرف محمد علی احمدی ہی کا ترجمہ پڑھا کرتے۔جس کی وجہ سے اس ترجمہ قرآن کو کافی شہرت مل گئی۔اور بہت سارے عوامی نمائندگان نے جو گاندھی جی کے قریب تھے، اسی ترجمہ کو پڑھنا شروع کر دیا۔''

انہی زعماء میں بھارت کے دوسرے عالم فاضل صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن بھی تھے۔قرائن اور شواہد سے یہی لگتا ہے کہ انہوں نے مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کا بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔''صحافت'' نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے فروری 1962ء میں اپنے ایک ماتحت افسر کو یہ نوٹ بھجوایا تھا:

''براہ کرم میرے لئے محمد علی احمدی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کی ایک کاپی فراہم کی جائے، کیونکہ جو کاپی میرے زیر مطالعہ ہے وہ کافی پرانی ہو چکی ہے۔''

NewAgeIslam.Com نے اسی خبر کو اُردو پریس کے حوالے سے پوری تفصیل کے ساتھ اردو سے انگریزی میں منتقل کیا ہے۔اس مقالے میں مذکورہ افسر کا نام غلام رسول متو آیا ہے۔ متعصب مقالہ نگار نے اس بات پر سخت تعجب وتشویش کا اظہار کیا ہے کہ مولانا محمد مارڈیوک پکتھال، علامہ یوسف علی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے انگریزی تراجم موجود ہونے کے باوجود کیوں مولانا محمد علی احمدی ہی کی تفسیر گاندھی جی اوران کے حلقے میں پڑھی جاتی رہی۔ان تمام محرکات اور اسباب کا پتہ لگایا جانا ضروری ہے۔مقالہ نگار کے اصل الفاظ یہ ہیں:

"It is a matter of research as to who advised him (i.e.Mahtama Gandhi) to read Muhammad Ali Ahmadi's Quran because Muhammad Ali Ahmadi was the greatest flag bearer of Qadianism in the subcontinent who promoted Qadianism with his venomous English writings....."

اصل مقالہ سے پہلے نیٹ کے ایڈیٹر نے "Was Mahatma Gandhi inclined towards Ahmadism?" کے عنوان سے ایک نہایت عالمانہ نوٹ درج کیا ہے۔نوٹ اس قابل ہے کہ اُس کو ھدیہ قارین کیا جائے۔ملاحظہ فرمائیں:

''اُردو پریس کا یہ پریس نوٹ حسب دستور عصبیت اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھرا ہوا ہے۔تاہم اس بیان سے اس بات کا پتہ تو چلتا ہے کہ مہاتما گاندھی اور بھارت کی دیگر نامور ہستیاں کس حد تک مولانا محمد علی کے شاندار انگریزی ترجمۃ القرآن کی شائق ومداح تھیں۔ہمارے جاہل علماء کے نزدیک کسی بھی احمدی مصنف کی تحریر کلمہ کفر کے

مترادف ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کی کمزور اور تنگ نظر آنکھ چیزوں کی گہرائی کو دیکھنے اور سمجھنے سے قاصر ہے۔ ویسے مولانا محمد علی اپنے ایک اور علمی شاہکار "The Religion of Islam" کے لئے بھی مشہور ہیں۔ اس کتاب مستطاب میں ہمارے دین اور عقائد کی کامل وضاحت ہے۔اس میں موجود رہنمائی دورِ حاضرہ کے تمام تقاضے پورا کرتی ہے۔اُس دور سے بھی کہیں بڑھ کر جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی۔مولانا محمد علی جناب مرزا غلام احمد صاحب کے ہم عصر تھے۔ وہ جناب مرزا صاحب کو فقط مجدد مانتے تھے۔(قادیانی) احمدیوں کی طرح غیر تشریعی نبی نہیں۔لیکن ہمارے نام نہاد علماء میں اتنی بھی لیاقت نہیں کہ وہ اس فرق ہی کو سمجھ سکیں۔ اگر کوئی شخص جناب مرزا صاحب کی اسلام سے متعلق کسی عمدہ ترین تحریر کی تعریف وتوصیف کردے تو یہ بات بھی ہمارے علماء کے نزدیک کفر کے برابر ہے۔''

سن ۱۹۲۵ء میں کابل کے فرسودہ خیال قدامت پسند علماء نے نعمت اللہ خان نامی ایک قادیانی مبلغ کو مرتد ٹھہرا کر سنگسار کردیا۔ ہندوستانی علماء نے کابلی علماء کو بڑا سراہا اور اس حرکت کو سنت رسولؐ اور قرآنی تعلیمات کے عین مطابق قرار دیا۔مہاتما گاندھی نے تنگ نظر اور جاہل علماء کے اس وحشیانہ فیصلے کو اسلامی تعلیمات کا غماز قرار دے کر ''ینگ انڈیا'' میں ایک نوٹ لکھا، جس پر مولانا محمد علی نے مہاتما گاندھی کو لاہور سے ایک تار بھیجا۔گاندھی جی نے اس تار کو شکریہ کے ساتھ بمع جواب اپنے اخبار میں شائع کردیا۔اس خط وکتابت کو اسی زمانہ میں احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے نقیب وآرگن اخبار ''پیغام صلح'' نے بھی چھاپا تھا۔ملاحظہ فرمائیں:

''مولانا محمد علی کا تار

قرآن نے کسی بھی جُرم پر رجم کی سزا کا حُکم نہیں دیا۔آپ کا نوٹ اسلام اور اس کے نبی ﷺ کے حق میں غیر منصفانہ ہے۔ اور خطرہ ہے کہ اس سے دنیا میں اسلام کے خلاف سخت تعصب پھیل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ نے خود سوچ سمجھ کر اس رائے کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ سُنی سنائی بات کو لکھ دیا ہے۔میرے انگریزی ترجمۃ القرآن کے اُن مقامات کو اگر آپ ملاحظہ فرمائیں جہاں اس مسئلہ کا ذکر ہے تو آپ کو یہ یقین ہوجائیگا کہ

آپ کو جن لوگوں نے ایسی اطلاع دی ہے وہ غلطی پر ہیں۔خدا کے لئے آپ اس پر غور کریں۔اوراس کی تردید کریں۔''

مہاتما جی کا جواب

''ڈاکٹر محمد علی (حضرت امیر ایدہ اللہ) نے میری تنقید کو غلط سمجھا ہے۔میں جانتا تھا کہ بعض لوگوں نے رجم کو ایک ایسی سزا قرار دیا ہے، جس کو بعض حالات میں قرآن نے بیان کیا ہے۔اپنی طرف سے کسی رائے کا اظہار کئے بغیر کہ آیا سزا قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہے یا نہیں۔میں نے صرف اس قدر کہا کہ اس کو محض قرآن کہ سند پر صحیح نہیں قرار دیا جاسکتا۔میں خوش ہوں کہ ڈاکٹر محمد علی نے مجھے یقین دلایا ہے، کہ قرآن میں رجم والی کوئی سزا نہیں۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کونسی وجوہات ہیں جن کی بنا پر کابل میں ایسی سزا کو حق بجانب قرار دیا گیا۔اور ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے ایک فریق نے اسکی تائید کی ہے۔میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی طرف سے سزائے رجم کے خلاف متحدہ طور پر نفرت کا اظہار ہو۔اگر ایسا ہو سکے تو اس سے آئندہ اسلامی دنیا میں ایسی سزا کا اعادہ غیر ممکن ہو جائے۔'' (بحوالہ پیغام صلح لاہور۔مورخہ۔۲۲مارچ ۱۹۲۵ء)

اسی ضمن میں لندن سے مبلغ اسلام الحاج خواجہ کمال الدین نے بھی ایک مکتوب گاندھی جی کو بھیجا تھا۔گاندھی جی نے اس خط کو بھی ''ینگ انڈیا ''میں شائع کر دیا تھا۔یہ خط وکتابت ووکنگ کے مشہور عالم رسالہ''اسلامک ریویو''میں موجود ہے۔

قائداعظم حضرت محمد علی جناحؒ

قائداعظم محمد علی جناحؒ اس وقت سے حضرت مولانا محمد علی کے ملنے والوں میں تھے جب کہ وہ محض مسٹر جناح تھے۔جب وہ مسلمانوں کے قائداعظم بنے تب بھی وہ دن کے اُجالے میں علی الاعلان سب کے سامنے مولانا کی کوٹھی واقع مسلم ٹاون لاہور پر تشریف لاتے رہے۔تشدّد پسند اور تنگ نظر احراری علماء نے متعدد بار یہی چاہا کہ قائداعظم احمدی مسلمانوں کو مسلم لیگ کا ممبر بننے سے روک دیں۔لیکن قائداعظم نے ان کی اس ڈیمانڈ کو ہمیشہ سختی سے رد کر دیا۔اور کہا کہ ہر وہ شخص

مسلمان کہلانے اور مسلمان سمجھا جانے کا حقدار ہے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہو۔ خیر یہ ایک الگ موضوع ہے، ہم یہاں اس پر بات نہیں کریں گے۔ مشہور مبلغ اسلام مولانا مرزا مظفر بیگ صاحب ساطعؔ جب اپنی میعاد پوری کر کے فیجی سے واپس وطن لوٹے تو ۱۹۳۹ء میں انہوں نے کراچی، ممبئی، مدراس، حیدرآباد دکن، آگرہ اور دہلی کا ایک طویل تبلیغی دورہ کیا، جس میں انہوں نے بہت سارے سرکردہ مسلمان رہنماؤں سے بھی ملاقات کی۔ قائداعظم سے ملاقات کی روداد بیان کرتے ہوئے مولانا ساطع فرماتے ہیں :

''میں بمبئی مالا بار ہل پر قائداعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے گیا۔ میں نے انہیں کہا : ''آپ داڑھی منڈاتے ہیں مگر آپ پر یہ کس قدر خدا کا احسان ہے کہ بڑی اور لمبی داڑھیوں والے پیر اور مولوی آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے ہیں۔ آپ خدا کا جتنا شکر ادا کریں تھوڑا ہے۔''

مُسکرا کر فرمانے لگے یہ ''بالکل درست ہے اور میں ہر روز خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔''

اس پر مَیں نے کہا :

''ایک محمد علی آپ ہیں جو مسلمانوں کے لئے سیاسیات میں لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک محمد علی مذہبیات میں لگے ہوئے ہیں اور اسلام کو ان کے شاہکار لٹریچر نے نئی شان بخش دی ہے۔''

فرمایا : ''مولانا محمد علی کا تمام لٹریچر یہ دیکھئے میری الماریوں میں موجود ہے۔ اور میں تو اردو تک نہیں جانتا۔ عربی کیا جانوں۔ میں نے ان ہی کتابوں سے اسلام کو سیکھا اور سمجھا ہے۔''

(لیکچر مولانا ساطع۔ مندرجہ پیغام صلح۔ مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

لاہوریوں کے ایک اور نامور مبلغ اسلام مولانا سید اختر حسین گیلانی نے ۱۹۴۴ء میں اپنی ملاقات کا احوال اخبار ''پیغام صلح'' میں شائع کروایا تھا۔ اس وقت قائداعظم حیات ہی تھے۔ اخبار ''مسٹر جناح سے ملاقات'' کی سرخی کے تحت لکھتا ہے :

''حضرت امیر ایدہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق آپ کی طرف سے ''مینول آف حدیث'' کا ایک نسخہ بطور ہدیہ پیش کرنے کے لئے جناب سید اختر حسین صاحب

گیلانی ۱۲نومبر کو قائداعظم محمد علی جناح کی کوٹھی نمبر ۱۰ اورنگ زیب روڈ، نئی دہلی پہنچے۔ اتفاق سے قائداعظم کا یہ آرام کا دن تھا۔ اورانہوں نے نیچے نہیں اترنا تھا۔ چنانچہ پٹھان دربان سید صاحب کا کارڈ قائداعظم کے پاس لے جانے سے بہت ڈرتا تھا۔ لیکن قائداعظم کی ہمشیرہ محترمہ خود قائداعظم کو اطلاع دینے گئیں، اور سید صاحب کو اوپر مسٹر جناح کے کمرے میں ملاقات کے لئے بلایا گیا۔ مسٹر جناح نے خوشی سے ہدیہ قبول کیا اور کہا کہ وہ خود حضرت مولانا محمد علی صاحب کو شکریہ کا خط لکھیں گے۔۔۔ مسٹر جناح ''ڈیون پورٹ کے مضامین اسلام پر'' جنہیں محمد امین بیرسٹر نے لاہور سے شائع کرایا ہے پڑھ رہے تھے۔ اور اس سلسلے میں اپنے نتائج سید صاحب کے سامنے بیان کرنے لگے۔ سید صاحب نے بالتفصیل عرض کیا کہ مغرب کسطرح اسلام کی تعلیم کا محتاج ہے۔ اوراس امر کا کسقدر احساس مغرب کے اہل فکر اصحاب کو ہو چکا ہے۔ سلسلہ گفتگو ہندوستانی یونیورسٹیوں کی طرف راجع ہوا۔ اور سید صاحب نے اس امر پر خصوصیت سے زور دیا کہ جب تک مسلمان نوجوان قرآن وسنت سے پورے واقف نہ ہوں گے اور اپنی تاریخ وتمدن کا علم نہ رکھیں گے، پاکستان کی بنیادیں مضبوط نہ ہوں گی۔ قرآن حدیث اور سیرت پر اردو اور انگریزی میں اتنا لٹریچر ہے کہ ہر یونیورسٹی آسانی سے اس کمی کو پورا کرسکتی ہے۔ قائداعظم نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ کہ قرآن مجید ہی درحقیقت ہماری تمام سیاست کی بنیاد ہے۔ اوراسی کو سمجھنا اور سمجھانا ہمارے مقاصد میں سے ہونا چاہیئے۔ قائداعظم نے بتایا کہ اگرچہ وہ عربی متن نہیں پڑھ سکتے لیکن مولانا محمد علی صاحب کا ترجمہ اور دیگر ضروری اسلامی لٹریچر ان کے پاس ہے جس کا وہ ہمیشہ مطالعہ کرتے ہیں۔'' (اخبار پیغام صلح لاہور۔ مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۴۴ء)

درس قرآن میں تفسیر ''بیان القرآن'' سے استفادہ

برصغیر ہندو پاک میں قرآن کریم کا درس دینے والوں نے بھی مولانا محمد علی صاحب کی ضخیم اُردو تفسیر ''بیان القرآن'' سے پورا پورا استفادہ حاصل کیا ہے۔اصل میں یہ عالمانہ تفسیر اسی غرض سے لکھی گئی ہے کہ لوگ قرآن پاک کو خود سمجھ کر پڑھیں اور دوسروں کو سمجھائیں۔ کہنے کو دیوبند کے شدت پسند علماء احمدیت اور اُس کے بانی حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانیؒ کے زبردست دشمن ہیں، لیکن درس کے معاملے میں وہ بھی مولانا محمد علی کی تفسیر ''بیان القرآن'' سے استفادہ حاصل کرتے رہے ہیں۔ دیوبند میں مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی درس قرآن دیا کرتے تھے۔ بنگال کے مولانا آفتاب الدین احمد اُن کے خاص شاگرد تھے۔خاص اس لئے کہ وہ بی۔اے پاس تھے۔اور پورے دیوبند میں اکیلے طالب علم تھے جو انگریزی جانتا تھا۔قادیانی مبلغ نعمت اللہ خان کی کابل میں سنگساری کیوجہ سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد علی لاہوری کے بیچ ایک قلمی جنگ چھڑ گئی۔مولانا شبیر عثمانی کابلی مولویوں کی اس حرکت کو قرآن وسنت کے عین مطابق قرار دیتے تھے۔جبکہ مولانا محمد علی کا ادّعا یہ تھا کہ قرآن وحدیث ہر دو سے اس فعل کی قطعاً کوئی تائید وحمایت نہیں ہوتی۔دونوں اطراف سے اپنے اپنے موقف کی تائید وحمایت میں دلائل اور براہین پیش ہوتے رہے۔لیکن بار بار کے اصرار پر بھی مولانا شبیر احمد صاحب اپنے موقف کی تائید میں قران کریم کی ایک آیت بھی پیش نہ کر سکے۔آخر میں خاموش ہو گئے۔مولانا آفتاب الدین احمد اس قلمی محاربے کو بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہے تھے۔مولانا شبیر عثمانی کی خاموشی انہیں بری طرح اکھر رہی تھی کیونکہ انہیں اس میں مولانا شبیر عثمانی کے موقف کی ہار نظر آئی۔شاگرد اور استاد میں اس موضوع

کولیکر تکرار بھی ہوئی۔ بالآخر مولانا آفتاب دیوبند کو الوداع کہکر لاہور چلے آئے اور مولانا محمد علی کی جماعت میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد وہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں انگلستان چلے گئے، اور نہایت کامیاب مبلغ ثابت ہوئے۔ مولانا آفتاب الدین احمد کا ایک بیان ''پیغام صلح'' لاہور میں چھپا ہے۔ اُس وقت مولانا شبیر احمد عثمانی زندہ ہی تھے، انہوں نے کبھی اس بیان کی تردید نہ کی۔ مولانا آفتاب کہتے ہیں کہ جب ہم کلاس میں مولانا عثمانی کا درس سنتے تو اُس میں بہت سے ایسے نکات ہوتے جو متداول تراجم اور تفاسیر میں موجود نہ ہوتے۔ اس سے ہم پر ان کی علمیت اور قرآن دانی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ایک دن کسی کام کی وجہ سے ہم اُن کے نجی کمرہ میں چلے گئے۔ اُس وقت مولانا عثمانی اپنا لیکچر تیار کر رہے تھے۔ ایک کتاب اُن کے سامنے کھلی پڑی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس کو بند کر کے دوسری کتاب کے نیچے رکھ دیا۔ جب ہم نے آگے بڑھ کر وہ کتاب باہر نکالی تو وہ لاہور کے مولانا محمد علی کی اُردو تفسیر ''بیان القرآن'' تھی۔

شروع شروع میں پاکستان کے غلام احمد پرویز صاحب بھی اپنے درس قرآن میں اسی تفسیر کو سامنے رکھ کر درس دیتے تھے۔ لیکن جب لوگوں کو پتہ چل گیا، تو ساتھ رکھنا ترک کر دیا۔ محترم پرویز صاحب کا اپنا بیان ہے:

> ''جب میں نے ''معارف القرآن'' کی طرح ڈالی تو مولوی محمد علی صاحب لاہوری کا قرآن انگریزی میرے سامنے تھا۔ اسی کے مطابق آیتوں کے نمبر لگائے تھے۔''
>
> (معارف القرآن۔ جلد اول۔ دیباچہ)

پرویز صاحب کی تفسیر میں نوّے فیصد باتیں وہی ہیں جو پہلے سے مولانا محمد علی کے علم الکلام میں ہیں۔ لندن کے نامور مبلغ اسلام الحاج مولانا شیخ محمد طفیل مرحوم کا ایک مقالہ اخبار پیغام صلح لاہور مجریہ ۳ اپریل ۱۹۵۵ء چھپا ہے۔ جس میں شیخ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ انہوں نے کراچی میں جناب پرویز صاحب کو حضرت مولانا محمد علی صاحب کی تفسیر بیان القرآن سے درس قرآن دیتے ہوئے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ پرویز صاحب اس بیان کے شائع ہونے کے بعد کافی سال زندہ رہے لیکن انہوں نے کبھی تردید نہ فرمائی۔

آج کل پاکستان میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے درس قرآن کا چرچا ہے(۱)۔اُن کے متعلق خود انہیں کے استاذ المکرّم مولانا امین احسن اصلاحی کا بیان ہے کہ وہ لاہور کے مولانا محمد علی احمدی کی تفسیر سے خاصے متاثر ہیں۔اس بات کی جھلک ڈاکٹر اسرار کے درس میں بھی صاف نمایاں ہے۔

ایک ایسا ہی واقعہ خاکسار مولف کو بھی پتہ چلا۔میں اور پروفسر نورالدین صاحب زاہدؔ مرحوم کشمیر کے نامور مفتی اور عالم دین مولانا مفتی جلال الدین مرحوم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔وہاں مولوی عبدالقدوس صاحب تشریف لائے، یہ صاحب سرکاری سکول میں اردو اور فارسی پڑھاتے تھے۔گفتگو کا رُخ مولانا محمد علی کی شاہکار تفسیر ''بیان القرآن'' کی طرف مڑا۔دوران گفتگو مولوی عبدالقدوس نے کہا کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ درگاہ شریف حضرت بل کشمیر میں واقع ''مدینۃ العلوم'' کے سربراہ مولانا عبدالکبیر صاحب اپنا درس قرآن تیار کرنے کے لئے مولوی محمد علی لاہوری کی بیان القرآن سے استفادہ کیا کرتے تھے۔یہ تفسیر ان کے ڈیسک پر کھلی ہوتی تھی۔مولوی عبدالقدوس نے کہا کہ میں نے مولانا عبدالکبیر سے سوال کیا کی جناب یہ تو ایک مرزائی کی تفسیر ہے۔انہوں نے جواب دیا: ہاں! اختلافی مقامات تو بس گنے چُنے ہوتے ہیں۔ ہمیں ان سے کیا لینا دینا۔لیکن حق بات یہ ہے کہ اس احمدی مفسر نے بعض ایسے نادر اور نایاب نکتے ابھارے ہیں جو ہمارے علماء کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے۔(فی الحال درس قرآن والے ٹاپک کو ہم یہیں چھوڑتے ہیں، کیونکہ اس پر مزید بحث آگے بھی آئے گی)

---

(۱)۔جس وقت یہ مقالہ لکھا جارہا تھا اُس وقت ڈاکٹر اسرار احمد زندہ تھے۔(خورشید)

قدامت پسند علماء کی مخالفت اور بے بنیاد پراپگنڈا

تاریخ مذاہبِ عالم کے کسی بھی دور کو اٹھا کر دیکھ لیں، جب بھی اللہ کے کسی نیک بندے نے اپنے زمانہ کی بے علمی، جاہلانا رسوم اور غیر معقول معتقدات کے خلاف آواز بلند کی تو قدامت پسند ہم عصر علماء نے اُس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ حتی الامکان عوام کو اُس سے ملنے یا اس کی بات سننے سے باز رکھا۔ اس کا آسان اور کارگر حربہ ہر دور میں ایک ہی رہا ہے۔ وہ یہی کہ مدمخالف کو کافر یعنی دین کے دائرہ ہی سے خارج قرار دیا جائے۔ اپنے فتویٰ کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بہت ساری فرضی اور من گھڑت باتیں فریقِ مخالف کے ذمہ ڈال دی جاتی ہیں۔ یہی طریقہ مولانا محمد علی لاہوری کے ساتھ برتا گیا۔ عوام کو بدظن کرنے کے لئے یہی کہا گیا کہ یہ شخص کافر ہے، اس کی تفسیر اور دیگر تصانیف غیر اسلامی باتوں اور غلط معتقدات سے بھری ہوئی ہیں۔ اِن سے رہبری کی اُمید تو دور اُلٹا گمراہ ہو جانے کا سنگین خدشہ ہے۔ لکھا پڑھا آزاد خیال طبقہ چونکہ پہلے ہی قدامت پسند علماء کی پکڑ اور اثر ورسوخ سے باہر ہوتا ہے۔ لہٰذا مولوی کے وعظ یا پراپگنڈا کا اُس پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ البتہ فرسودہ اور دقیانوسی نظریات اور معتقدات سے چمٹے رہنے والے، رسم ورواج کے خوگر پڑھے لکھے لوگ علم وعرفان کے اس جدید خزینۂ بے بہا سے مدتوں بے خبر اور بے نصیب ہی رہتے ہیں۔

ایک وقت وہ تھا جب یورپ کو اُن کے عیسائی مشائخ اور علماء یہی بتاتے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم۔ نعوذ باللہ) دُنیا کا سب سے زیادہ غیر مہذب، وحشی اور ملک وملت کا سب سے خطرناک دشمن ہے۔ غلط بیانیوں کا یہ سلسلہ صدیوں تک چلتا رہا۔ لیکن جب عیسائی عوام نے اسلام اور بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور قرآن شریف کا خود مطالعہ کیا، تو انہیں اپنے مذہبی رہنماؤں کی غلط بیانی کا پتہ چلا۔ نتیجہ یہ کہ انہوں نے اپنے مذہبی قائدین اور زعماء کے خلاف آواز

بلند کردی۔پہلی زور دار اور مؤثر آواز مشہور مغربی مفکر تھامس کارلل (Thomas Carlyle) نے 1840ء میں اٹھائی۔ اُس نے اپنی تصنیف "Heroes & Hero-worship" (جواصل میں اُس کے لیکچروں کا مجموعہ ہے) میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو دُنیا کا کامیاب ترین انسان بتایا۔اور کہا کہ ہمارے اسلاف کا کتنا بڑا ظلم اور بہتان ہے کہ نیکی اور اخلاق کے اس بے مثال نفس قدسی کو برا بنا کر پیشکر تے رہے ہیں۔اور ایسے ایسے بے بنیاد اتہام اور غلط باتیں اس کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں جن کو پڑھ کر ہم شرمسار ہوجاتے ہیں اور ندامت سے سر جھک جاتے ہیں۔اور لکھا کہ ہمیں سب سے بڑا دُکھ اسی بات کا ہے کہ کذب و بہتان کا یہ غلط رویہ انہی لوگوں نے اپنایا جو خود کو سب سے زیادہ دِیندار اور پرہیز گار ٹھہراتے تھے۔

حال ہی میں مائیکل ایچ ہارٹ (Michael H. Hart) نے "100 Great" نامی کتاب شائع کی۔مصنف عقیدے کے اعتبار سے عیسائی ہے، پھر بھی اُس نے اس لسٹ میں سرفہرست حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو رکھا۔ وجہ بتاتے ہوئے لکھتا ہے :

"My choice of Muhammad to lead the list of world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful on both religious and secular levels" (P.33)

''میں نے دُنیا کی سب سے زیادہ اثر دار ہستیوں کی لسٹ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے اوپر رکھا ہے۔ یہ بات کچھ قاریوں کو حیران کردے گی، بعض لوگ اس پر سوالیہ نشان کھڑا کردیں گے۔لیکن سچ یہی ہے کہ تاریخ عالم میں ایک ہی انسان ایسا ہے جو مذہبی اور دنیاوی، دونوں ہی اعتبار سے کامیاب ترین ثابت ہوا ہے۔''

یہی بات آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام ابن غلام یعنی حضرت مولانا محمد علی صاحب کے ساتھ دوہرائی گئی۔تنگ نظر اور قدامت پرست علماء نے حضرت مولانا محمد علی کی تفسیروں اور دیگر تصنیفوں کی نسبت بنا پڑھے ہی یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ان میں بہت کچھ ایسا ہے جو کہ غیر اسلامی اور گمراہ کن ہے پس مسلم عوام کے لئے ان سے احتراز لازم ہے۔مثال کے طور پر جمعیت علمائے

ہند کے سابق نائب صدر مولانا اخلاق حسین قاسمی نے آدھی صدی قبل لکھا تھا :

''اُردو کی تفسیروں میں محمد علی صاحب مرزائی کی تفسیر زمانہ حال کی اچھی تفسیروں میں شمار ہوتی ، اگر اس میں مرزائیت کے جراثیم نہ ہوتے ۔ اور مرزا غلام احمد جیسے خبطی انسان کی مجددیت کا پروپگنڈہ نہ ہوتا۔''

(کتابچہ ۔مودودی صاحب کی تفسیر پر محققانہ نظر)

سن ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ایک مختصر سی کتاب بنام ''جائزہ تراجم قرآنی'' شائع ہوئی ۔ اسکے صفحہ نمبر ۵۱ پر ''ترجمہ محمد علی لاہوری'' عنوان کے تحت یہ عبارت ملتی ہے :

''مترجم جماعت احمدیہ کے امیر تھے۔ انہوں نے یہ ترجمہ اپنی تفسیر بیان القرآن کے ضمن میں اپنی جماعت احمدیہ کے لئے اپنے معتقدات کو پیش نظر رکھ کر کیا ہے۔ ترجمہ بلحاظ زبان وانشاء شستہ اور سلیس اور عام فہم عبارت میں ہے۔ مگر چونکہ خاص معتقدات کو محور قرار دے کر بیان القرآن کی تصنیف عمل میں آئی ہے۔ اس لئے عام مسلمانوں کے لئے اس کے مطالعہ میں مضرت کا سخت اندیشہ ہے۔''

یہ غلط بیانی سالہا سال جاری رہی، لیکن جب بھی اور جہاں بھی کسی منصف مزاج محقق نے پرانی لکیر کو چھوڑ کر اصل حقائق کی خود چھان بین کی ، تو حق بات آپ سے آپ نکھر کر سامنے آ گئی۔ ماہنامہ ''اسلامی دائجسٹ'' کراچی پاکستان نے اپنے مارچ 1996ء کے شمارے میں ''تشریح القرآن'' کے عنوان سے قرآن پاک اور اس کے اُردو اور انگریزی تراجم کے متعلق نہایت علمی اور خیال آفرین مضامین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں قرآن شریف کے قدیم اور جدید معروف تراجم اور تفاسیر کا غیر جانب دارانہ تبصرہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔ حضرت مولانا محمد علی علیہ الرحمتہ کے انگریزی ترجمۃ القرآن اور تفسیر 'بیان القرآن' کے متعلق جو تبصرہ کیا ہے۔ اُس کو ملاحظہ فرمائیں:۔

''مولوی محمد علی صاحب کی یہ (انگریزی) تفسیر علامہ عبداللہ یوسف علی کی تفسیر سے سترہ سال قبل 1917ء میں شائع ہو چکی تھی۔ اسی لئے علامہ صاحب نے اپنی تفسیر کے دیباچے میں انگریزی زبان کی دوسری تفاسیر کے علاوہ اس تفسیر کا بھی تعریفی انداز میں ذکر کیا ہے

۔اور لکھا ہے۔

''انجمن احمدؐیہ لاہور نے مولوی محمد علی کی تفسیر مع ترجمہ شائع کی ہے، جو اتنی مقبول ہوئی ہے کہ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں، یہ ایک محققانہ اور فاضلانہ کام ہے۔ تفسیری وتشریحی مواد بہت مناسب وکافی ہے اور آخر میں جو اشاریہ شامل کیا ہے وہ جامع ہے۔''(۱)

مولوی صاحب کا اسلوب یہ ہے کہ سورت کے شروع میں خلاصہ مضمون لکھتے ہیں۔اس کے بعد اس کا تعلق کن سورتوں اور آیتوں سے ہے، اس کی وضاحت کرتے ہیں۔تاریخ نزول اور ترتیب نزول آیات پر بحث کرتے ہیں۔ربط وتعلق کے ضمن میں تین قسم کے ربط وتعلق پر زیادہ زور دیتے ہیں۔اوّل آیات کا باہمی تعلق، دوم رکوعوں کا باہمی تعلق اور سوم سورتوں کا باہمی تعلق۔

انگریزی تفسیر وترجمہ کے پانچ سال بعد اُردو تفسیر وترجمہ بھی ''بیان القرآن'' کے نام سے شائع ہوا۔لیکن چونکہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تفسیر کا بھی

---

(۱) شاید تبصرہ نگار کو یہ معلوم نہیں کہ علامہ عبداللہ یوسف علی انگریزی زبان کے ماہر تو تھے لیکن انہیں عربی نہیں آتی تھی۔وہ قرآن کے ترجمے کو آزاد نظم (Blank verse) میں پیش کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ جب علامہ اقبال مرحوم کو یہ پتہ چلا کہ یوسف علی صاحب قرآن پاک کا ترجمہ کرنے لگے ہیں۔تو انہوں نے بے اختیار یہ ریمارک پاس کیا :

''جس طرح امام حسینؓ کی ذات مظلوم تھی، اسی طرح آج قرآن کریم مظلوم ہے۔کیونکہ اس کا انگریزی ترجمہ یوسف علی اور اُردو ترجمہ حکیم احمد شجاع کر رہے ہیں۔''(پیغام صلح 18 اکتوبر 1967ء)

شروع شروع میں عبداللہ یوسف علی اپنا مسودہ تصحیح کیلئے مولانا محمد علی کے پاس بھیجا کرتے تھے۔پھر جب لاہور کے اسلامیہ کالج میں پروفیسر سے پرنسپل ہوگئے تو یہ سلسلہ بند کردیا۔اُن کا ترجمہ پہلے ایک ایک پارہ کرکے چھپتا رہا۔اُس میں انہوں نے مولانا محمد علی کی طرح وفات مسیح کا اعلان کردیا۔جس پر مولوی لوگ بری طرح بگڑے۔مجبوراً انہیں وہ بات ترجمہ سے خارج کردینا پڑی۔دیباچہ کے علاوہ انہوں نے حواشی میں بھی جگہ جگہ مولانا محمد علی کو کوٹ (Quote) کیا ہے۔اللہ تعصب اور تنگ نظری کا برا کرے! مکہ معظّمہ کی مسلم ورلڈ لیگ نے علامہ یوسف علی کا انگریزی ترجمہ بمع تفسیر دوبارہ شائع کیا۔اس میں علامہ یوسف علی کا رقم فرمودہ دیباچہ تو حذف ہے ہی اس کے علاوہ اُن تمام عبارتوں کو چن چن کر فٹ نوٹوں سے نکال دیا گیا ہے جن میں حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔کسی وفات یافتہ شخصیت کی تصنیف میں اس طرح کی کتر بیونت اور بے جا تصرف غیر قانونی ہی نہیں غیر اخلاقی بھی ہے۔اس طرح تو کسی بھی تصنیف یا کتاب کی اصلیت باقی ہی نہ رہے گی، ایک دم مشکوک ہوجائے گی۔اللہ کی شان! یہ سب کرنے کے باوجود کتابیات (Biblography) والے صفحہ پر حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کا نام موجود ہے۔(خورشید)

یہی نام ہے اور شہرتِ عام بھی اس کے حصے میں آئی۔اس لئے یہ تفسیر مولوی محمد علی کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ڈاکٹر صالحہ اس تفسیر وترجمہ کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتی ہیں(۱): ۔

''ترجمہ سلیس ہوتے ہوئے ادبی متانت لئے ہوئے ہے۔لسانی حیثیت سے فصاحت اور شستگی ہے۔معنوی لحاظ سے کئی لوگوں کو ان کے عقائد اور خیالات کی وجہ سے ان کے ترجمہ وتفسیر پر اعتراض ہے۔دراصل وہ جماعت احمدیہ، لاہوری گروپ کے امیر تھے اس کے باوجود ہمارے خیال میں ان کا ترجمہ وتفسیر ''غلط عقائد'' کی ترجمانی سے تقریباً خالی ہے۔انہوں نے بڑے محتاط ہوکر، بڑے خلوص سے اور رائے عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ترجمہ لکھا ہے۔نص قرآن اور ترتیب الفاظ کا خیال رکھنے کے باوجود ترجمے میں روانی اور تسلسل قائم ہے(۲)'' (اسلامی ڈائجسٹ کراچی، مارچ 1996ء)

عثمانیہ اکیڈمک ٹرسٹ کراچی نے 1994ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد نسیم عثمانی کی ایک عالمانہ تخلیق ''اُردو میں تفسیری ادب : ایک تاریخی اور تجزیاتی جائزہ'' شائع کی ہے۔اس میں فاضل مصنف نے حضرت مولانا محمد علی علیہ الرحمتہ کی اُردو تفسیر 'بیان القرآن' کے متعلق جو تبصرہ کیا ہے، اس کو ہم نیچے من وعن قارئین کرام کی نذر کررہے ہیں:

''یہ ترجمہ وتفسیر، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی مشہور تفسیر ''بیان القرآن'' سے مختلف ہے ۔اس کے لکھنے والے لاہوری جماعت احمدیہ کے امیر مولانا محمد علی ہیں۔اس تفسیر کو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔مولانا محمد علی نے ابتداً قرآن کریم کا ترجمہ

---

(۱) یہ اقتباس ''قرآن حکیم کے اُردو تراجم'' از ڈاکٹر صالحہ عبدالحکیم شرف الدین۔ص 325 سے لیا گیا ہے۔یہ کتاب شرف الدین اینڈ سنز ممبئی نے شائع کی ہے۔نیٹ پر دستیاب ہے۔(خورشید)

(۲) غیر جانب دارانہ ومحققانہ رائے تو آپ نے پڑھ لی۔اب تعصب میں ڈوبی یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائیں:۔

''کیا بلحاظ معنی اور کیا باعتبار اندازِ بیان (مولوی محمد علی لاہوری کی 'بیان القرآن'۔ناقل) ایسی پھسپھسی کتاب شاید ہی کہیں ملے۔یہی حال ان کی اور تصنیفات کا ہے''۔(طلوع اسلام، دسمبر 1953ء)

یہ الفاظ کسی جاہل یا بے علم مولوی کے نہیں بلکہ ہندوپاک کے مشہور جریدہ ''طلوع اسلام'' کے روشن خیال مدیر محترم کے رقم فرمودہ ہیں۔اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّااِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.(خورشید)

وتفسیر انگریزی زبان میں کیا تھا،لیکن پھر اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی غرض سے اس کواُردو میں منتقل کیا تھا۔ چونکہ اُردو میں تفسیر کو زیادہ پھیلا کر بیان کیا گیا ہے۔اس لئے اس کو تین جلدوں میں چھاپا گیا تھا۔ یہ ایڈیشن 1924ء تک کے عرصہ میں شائع ہوا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد اس کے تین ایڈیشن ایک ایک جلد میں شائع ہوئے۔یعنی 1969ء ،1972ء اور 1980ء میں۔۱۹۸۰ء میں اس کو نہایت اہتمام سے چھاپا گیا۔مترجم ومفسر خود تمہید میں فرماتے ہیں:۔

''وہ مقدس پیغام (قرآن کریم) ان لوگوں کی زبان میں نازل ہوا،جنہوں نے دنیا میں اس کے حامل بننا تھا۔مگر آج اس عالم کے مختلف اطراف واکناف میں رہنے والے مسلمان اس زبان سے نا آشنا ہیں اور بہت ہیں کہ اس پیغام کو پڑھتے ہیں مگر انہیں علم نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ظاہر ہے کہ اگر اس پیغام کی غرض یہ تھی کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور غلط راہوں کو چھوڑ کر اپنی دینی اور دُنیوی فلاح کا صحیح راستہ اختیار کریں تو اس کا مطلب سمجھے بغیر وہ غرض حاصل نہیں ہوسکتی۔ میں نے جب تبلیغِ اسلام کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انگریزی میں اس پاک کلام کے ترجمہ اور مطلب کو بیان کیا تو بہت سے احباب نے یہ اصرار کیا کہ اُردو زبان میں بھی اپنے اہل ملک کے فائدہ کے لئے اسے شائع کیا جائے۔مگر یہاں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے از سرنو کام کرنا پڑا۔میری غرض صرف یہ ہے کہ ہر ایک مسلمان قرآن کریم کو پڑھے اور اس کے مطلب پر آگاہ ہو کر اپنی روزمرہ زندگی میں اور مشکلات پیش آمدہ میں اپنا ہادی اور رہنما بنائے۔اس راہ کو اختیار کئے بغیر مسلمان کبھی موجودہ مشکلات سے باہر نہیں نکل سکتے۔''

آگے چل کر مترجم ومفسر جناب محمد علی فرماتے ہیں:۔

''اس ترجمہ اور ان حواشی میں ایک بات کی طرف بالخصوص توجہ دلانا چاہتا ہوں۔قرآن کریم سے اجنبیت نے جن دلوں میں یہ خیال پیدا کیا ہے کہ اس

پاک کتاب کے مضامین میں کوئی ترتیب نہیں ، انہوں نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ موجودہ ترتیب اللہ تعالیٰ کی وحی سے ہے اور یہ ایک ابلغ اور محکم ترتیب ہے۔ مخالفین میں غور وخوض کی کمی نے بے ترتیبی کا خیال پیدا کیا۔ یہاں تک کہ اس زمانہ میں ایک مسلمان نے بھی ان خیالات سے متاثر ہو کر ایک ترتیب نزول اپنے پاس سے بنا کر قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے(۱)''

غرض مترجم ومفسر نے سطور بالا میں جو خیالات پیش کیے ہیں وہ مسلمانوں کے سواد اعظم سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس میں (قادیانی خلیفہ) مرزا بشیر الدین محمود (احمد) کی 'تفسیر صغیر' سے نمایاں فرق نظر آئے گا۔ اس فرق کو جاننے کے لئے مندرجہ ذیل آیات کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ کیجئے:

''مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا. (۳۳:۴۰)

ترجمہ: محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

تفسیر: خَاتَم النَّبِيّٖن کی تفسیر احادیث نبوی سے : خَاتَم النَّبِيّٖن کے معنی لغت

(۱) یہ انگریزی ترجمہ مولانا مرزا ابوالفضل نے کیا تھا۔ جس کو 1911ء میں اصغر اینڈ کمپنی الہ آباد نے بمع عربی متن شائع کیا۔ اس کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ آج یہ قدیم میوزیموں میں بھی کمیاب ہے۔ وفات سے قبل یعنی پچاس کے دہاکے میں مرزا ابوالفضل نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ (بلا عربی متن) شائع کیا۔ جس میں قرانی سورتوں کی عام متداول ترتیب کو برقرار رکھا گیا ہے۔ اس ترجمہ میں صرف ایک ہی فٹ نوٹ ہے۔ جس میں حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ محترمہ کے کشمیر کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر ہے۔ اخیر پر عربی الفاظ کی فرہنگ شامل ہے۔ جس میں 'مسیح' عنوان کے تحت حضرت عیسیٰؑ کے صلیب سے زندہ بچ نکلنے اور پھر بعد وفات کشمیر میں دفن ہونے کا اقرار ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک حدیث بھی لائے ہیں۔ جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ 125 سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ مرزا ابوالفضل نے 'غریب القرآن فی اللغات الفرقان'، نام سے قرآن کی ایک عمدہ لغت بھی شائع کی ہے۔ اسمیں بھی وفات مسیح کا اقرار موجود ہے۔ چنانچہ آیت اِلٰـى رَبْـوَةٍ ذَاتِ قَـرَارٍ وَّمَعِيْـنٍ. (سورت 23 آیت 50) کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ''ایسی بلند سرزمین میں جہاں میووں کی افراط ہے اور نہریں جاری ہیں۔ یہ بیان ہے اس سرزمین کا جہاں صلیبی کارروائی کے بعد حضرت مسیح اور ان کی والدہ ماجدہ کو پناہ ملی۔ مولوی محمد علی اپنے ترجمہ قرآن مجید میں یہ مقام کشمیر کو قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ آنجنابؑ کے تاریخی حالات بھی اس کے معاون ہیں۔ (غریب القرآن۔ ص126) (خورشید)

سے اوپر بیان ہو چکے ہیں۔انبیاء علیہاالسلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خاتَم یا خاتم ہونا صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے۔یعنی ان میں سے آخری ہونا۔پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔ یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خاتم النبیین کی تشریح کی گئی ہے۔ یا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے۔اور یہ احادیث متواترہ ہیں۔ جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں ۔ اورامت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں۔'' (اُردو میں تفسیری ادب''ص516تا418)

بہاول پور والے تاریخی مقدمے میں، جو قادیانیوں کے خلاف تھا، دیوبندی علماء نے اپنے بیان میں حضرت مولانا محمد علی لاہوری کی مایہ ناز تفسیر '' بیان القرآن'' کو بھی بطور سند پیش کیا تھا :

''قران مجید میں ہے وَلٰکِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ۔ اس آیت کی تفسیر میں مولوی محمد علی لاہوری نے جلد سوم ص ۵۱۵ میں لکھا ہے کہ خَاتَمَ النَّبِیّٖن کے معنی لغت سے اوپر بیان ہو چکے ہیں ۔اور کسی قوم کا خاتم یا خاتَم ہونا صرف ایک ہی معنے رکھتا ہے۔یعنی ان میں سے آخری ہونا۔پس نبیوں کے خاتَم ہونے کے معنے نبیوں کی مہر نہیں۔جیسا کہ قادیانی کہتے ہیں۔ بلکہ آخری نبی ہیں۔''

(بیانات علمائے ربانی برارتداد فرقہ قادیانی۔ص۱۳۔ناشر مکتبہ رشاد دیوبند)

نامور اکابر علماء کی آراء

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم

حضرت مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے کچھ تحریری بیان ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔سن ۱۹۶۶ء میں مشہور اردو ماہنامہ ''نظام'' کانپور نے ایک نہایت معلوماتی ''قرآن نمبر'' نکالا۔جس میں ملک کے نامور علماء اور فضلاء کے مقالے شامل کئے گئے۔اس خصوصی نمبر کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے بھی ایک مقالہ رقم فرمایا تھا،جس میں وہ لکھتے ہیں :

''ادھر یہ سب ہو رہا تھا کہ اُدھر لاہور سے ۱۹۱۸ء میں ایک خاص اہتمام کے ساتھ ایک نیا ترجمۃ القرآن حامل المتن مع حواشی تفسیری نکلا۔ یہ ترجمہ مولوی محمد علی ایم۔اے امیر جماعت احمدیہ لاہور کے قلم سے تھا۔اور یہ انگریزی ترجموں کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔یہ تفسیری ترجمہ جدید انگریزی خوان جماعت کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خوب مقبول ہوا۔غیر مسلموں میں بھی اس کی مانگ اچھی ہوئی۔اور مدتوں یہی ترجمہ باہر والوں کی نظر میں اسلامی حیثیت سے مستند سمجھا جاتا رہا۔

اس کے شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں اصول دین وعقائد واحکام شریعت سب ضروری تفصیل کے ساتھ آ گئے ہیں۔غیر مسلموں کو اسی کے ذریعہ سے پوری واقفیت اور راہنمائی اسلام کے متعلق ہو جاتی ہے۔پھر ہر سورت کے شروع میں سورۃ کے مضامین ومباحث سے متعلق ایک سلجھا ہوا مقدمہ ملتا ہے۔''

(ماہنامہ ''نظام'' کانپور ہند۔قرآن نمبر۔مضمون 'قرآن کے انگریزی تراجم'۔)

اب حضرت مولانا محمد علی صاحب لاہوری کی مایہ ناز اُردو تفسیر ''بیان القرآن'' کے بارے میں مولانا دریابادی کی رائے ملاحظہ فرمائیں:۔

''محمد علی لاہوری کی انگریزی تفسیر قرآن.....اورسب سے بڑھ کران کی اُردو تفسیر'بیان القرآن' تین جلدوں میں .....بحیثیت مجموعی بڑی قابل قدر ہے۔اسلام اورقرآن کی حقانیت کانقش دل پرثبت کردینے والی۔''

(معاصرین۔ص43۔طبع اوّل1979ء)

ایک اچھی اورکامیاب تفسیر کی خوبی یہی ہے کہ وہ قاری کے دل ودماغ پر اسلام اورقرآن کی صداقت کچھ اس طرح ظاہر کردے کہ اُس کا اثر اور نقش ہمیشہ کیلئے ثبت ہوکر رہ جائے۔

حافظ غلام سرور (مترجم قرآن بزبان انگریزی)

اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن کے دیباچے میں لکھتے ہیں :

''مولانا محمد علی صاحب نے سابقہ مترجموں کی بیسیوں غلطیوں کی اصلاح کی ہے۔اور جہاں بھی انہوں نے اختلاف کیا ہے وہاں ان کا ترجمہ یا تو بالکل درست وصحیح ہے یاان کے ترجمہ کی بنیاد و اساس عربی زبان کی مستندلُغات پر ہے۔ہمارے اس بیان سے کوئی یہ نتیجہ نہ نکال لے کہ مولانا محمد علی نے (نعوذ باللہ) قرآنی الفاظ کو نئے معنی پہنائے ہیں۔اگر قاری عجلت اور جلد بازی سے کام نہ لے تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مولانا موصوف ایک بلند پایہ عالم فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم محقق بھی ہیں۔میں یہ بھی نہیں کہتا کہ مولانا موصوف کے بعض حواشی میں ندرت یا نیا پن موجود نہیں۔لیکن یہ کوئی نقص یا عیب کی بات نہیں۔کوئی بھی شخص جو قرآن پاک کی ترجمانی میں پوری دیانتداری اور کامل خلوص سے کام لے گا۔اُس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تحقیق ومطالعہ کے نتائج کو کھل کر بیان کرے۔ترجمہ کی لکھائی اور چھپائی غیر معمولی طور پر دیدہ زیب اغلاط واسقام سے پاک ہے۔یہ ترجمہ شروع سے اخیر تک مولانا کی قرآن کے تئیں والہانہ عقیدت اور فریفتگی کا غماز ہے۔ اس عمدہ شاہکار کے لئے مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی مولانا محمد علی کے ہمیشہ رہین احسان رہیں گے۔''

(Translation of the Holy Qur'an, page xxxvii)

امرتسر کا معتبر اور مشہور اخبار ''وکیل''

اس اخبار کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ عبداللہ العمادی جیسے نامور اہل قلم واصحاب علم وفضل اس کے مدیر رہ چکے ہیں۔ 5/اپریل 1919ء کے شمارے میں ''کتاب مبین کا انگریزی ترجمہ۔ایک زرین وکامیاب کوشش'' کے عنوان کے تحت مدیر محترم کا ایک بے لاگ شاندار تبصرہ چھپا تھا۔ملاحظہ فرمائیں:۔

''تین چار سال پیشتر ان کالموں میں تراجم قرآن کا ذکر کیا گیا تھا۔ جو مختلف ازمنہ میں دُنیا کی مختلف زبانوں میں کئے گئے ہیں۔اس سلسلہ میں ان تراجم کا بھی حوالہ دیا گیا تھا، جو خود مسلمانوں نے علاوہ مشرقی زبانوں کے مغربی اور بالخصوص انگریزی زبان میں کئے۔1905ء میں ڈاکٹر عبدالحکیم خان نے ..... 1911ء میں .....مرزا ابوالفضل نے .....ایک انگریزی ترجمہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی تحریک سے نواب عبادالملوک بہادر نے شروع کیا تھا۔لیکن یہ ترجمہ تکمیل پذیر نہیں ہوا۔ایک انگریزی ترجمہ انجمن ترقی اسلام قادیان نے 1915ء میں علیحدہ علیحدہ پاروں میں شائع کیا تھا۔(اس کا صرف ایک ہی پارہ شائع ہوا تھا۔خورشید).....ترجمہ وتفسیر دونوں عمدہ ہیں۔مگر فرقہ بندی کی روح جابجا نمایاں ہے۔

ان سب سے زیادہ مکمل وہ انگریزی ترجمہ ہے جو مولوی محمد علی صاحب ایم، اے۔ایل ایل بی، صدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور نے شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ ظاہری اور معنوی خوبیوں سے لبریز ہے۔اس کی مراکشی چمڑے کی سیاہی مائل سبز جلد جو نرمی اور پائیداری کے دوگونہ اوصاف رکھتی ہے۔معہ اپنے زرین طغرا کے نہایت دِلفریب معلوم ہوتی ہے۔خود متن، ترجمہ اور تفسیر اعلیٰ پایہ کے انڈیا پیپر پر شائع ہوئی ہے۔انڈیا پیپر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہلکا، مہین، سفید اور مضبوط ہوتا ہے۔اور اگر ایسا کاغذ کسی تحریر سے مزین ہونے کا حق رکھتا ہے تو وہ خدا کے پاک کلام کی تحریر ہے۔انڈیا پیپر پر کلام اللہ کا نقش دیکھنے والے کے دل میں روحانیت کا غیر معمولی جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔اور انسانی فطرت اس کے حسن سے مسحور ہو کر سربسجود ہونے پر مجبور ہو جاتی ہے۔یہ حالت ہم پر طاری ہوئی جب ہمنے نسخہ زیر نظر کی تلاوت شروع کی۔

یہ نہیں کہ روحانیت کا جذبہ حسن ظاہری کا محتاج ہے۔لیکن کیا اس میں شک ہے کہ حسن ظاہری حسن معنوی میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ پڑھنے والے کی نظر ان ظاہری اوصاف سے گزر کر سب سے پہلے ترتیب مطالب پر پڑتی ہے۔مقدمہ جو 95 صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ دو حصوں میں منقسم ہے۔(۱) تعلیماتِ قرآن۔(۲) جمع وترتیب قرآن۔ ان مطالب کی تشریح وتوضیح میں فاضل مترجم نے تعلیمات قرآن کو گویا ''دریا بہ کوزہ'' کر دیا ہے۔ ہماری یہ رائے ہے اوراس میں کسی قسم کی عقیدتمندی کو مطلق دخل نہیں ہے۔ کہ اگر غیر مذاہب کے لوگ ان صفحات کو تعصب کی آلائشوں سے پاک ہوکر پڑھیں تو مذہبی دُنیا کے خیالات میں بہت کچھ تغیر واقع ہو جائے۔

تشریح طلب الفاظ کی فہرست اور فہرست مطالب بالترتیب حروف تہجی نے قرآن کے مطالب تک رسائی کو بالکل آسان بنا دیا ہے۔ ہر سورہ کے شروع میں تمہیدی نوٹ دیئے گئے ہیں۔ ہر سورہ کے متن کے بالمقابل انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔اور ذیلی حواشی میں ان کی تفسیر دی گئی ہے۔ان سب کی ترتیب قابل تعریف ہے۔ ترجمہ کو ہم نے جابجا نظر امعان دیکھا ہے۔اوراس پر کامل غور کے بعد ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں ہے کہ اس کی سادگی۔سلاست روانی اور صحت قابل رشک ہے۔تفسیر کو حیرت انگیز بے طرفداری کے ساتھ فرقہ بندی کی الجھنوں سے پاک رکھ کر، عام اور مستند اسلامی خیالات کو اس میں فراہم کیا گیا ہے۔اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب دینے میں جدید آلاتِ مدافعت سے کام لیکر صواب اندیشی ومصلحت بینی کا ثبوت دیا گیا ہے۔''

(بحوالہ ''افکار محمد علیؒ''۔جلد 5۔ص 210 تا 211۔طبع اوّل)

مولانا عثمانی غنی طاہر

'مکتبہ الحسنات' ہند کے نامور عالم دین مولانا عثمان غنی طاہر اپنی نہایت مفید ومعلوماتی تالیف ''معلومات قرآن'' میں ''قرآن مجید کے انگریزی تراجم'' عنوان کے تحت حضرت مولانا محمد علی کا ذکر خیر یوں فرماتے ہیں:۔

''لاہور سے 1918ء میں ایک خاص اہتمام کے ساتھ ایک نیا ترجمۃ القرآن

حامل المتن مع حواشی تفسیر نکلا۔ یہ ترجمہ مولوی محمد علی ایم،اے۔امیر جماعت احمدؑیہ لاہور کے قلم سے تھا۔ یہ تفسیری ترجمہ جدید انگریزی خوان جماعت کی ذہنیت کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا۔اور تعلیم یافتہ مسلمانوں میں خوب مقبول ہوا۔غیر مسلموں میں بھی اس کی مانگ اچھی خاصی ہوئی اور مدتوں یہی ترجمہ باہروالوں کی نظر میں ''اسلامی'' حیثیت سے مستند سمجھا جاتا رہا ہے۔اس کے شروع میں ایک بڑا مفصل دیباچہ ہے۔جس میں اصول دین وعقائد واحکام شریعت سب ضروری تفصیل کے ساتھ آگئے ہیں۔اور غیر مسلموں کو اسی کے ذریعے سے پوری واقفیت اور رہنمائی اسلام کے متعلق ہوجاتی ہے ۔ پھر ہر سورت کے شروع میں سورت کے مضامین ومباحث سے متعلق ایک سلجھا ہوا مقدمہ ملتا ہے۔صفحے کے دو کالموں میں داہنے میں متن قرآن درج ہے اور بائیں کالم میں آیت کا نمبر ڈال کر اس کا انگریزی میں ترجمہ ہے۔نیچے کے حصے میں تفسیری حواشی درج ہیں۔''احمدیت'' ان حواشی میں زیادہ نہیں ،البتہ ''سید احمد خانیت'' اچھی خاصی موجود ہے۔یعنی معجزات وخوارق کی تاویلات۔ اس کے کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔اور 1938ء میں اس کا اختصار بھی شائع ہو چکا ہے ۔یعنی محض ترجمہ بہ حذف تفسیری حواشی۔''

(معلومات قرآن۔ص186 تا187۔1992ء)

اسی کتاب کے صفحہ 188 پر لکھا ہے کہ مصنف ہذا نے بھی قرآن پاک کا ایک ترجمہ انگریزی میں کیا ہے۔جس کی تیاری میں انہوں نے پکتھال اور مولانا محمد علی کے تراجم سے بھی استفادہ کیا۔ ترجمہ کا کام 1933ء میں شروع ہوا اور 1939ء کے آخر میں مکمل ہوا۔لیکن چھپنے کی نوبت 1960ء میں آئی۔

الازہر مصر کے نامور عالم امیر شکیب ارسلان مرحوم

''میں کہتا ہوں کہ اُن میں سے بہت سی ضروریات کو پورا کرنے میں ہندوستان کے علماء کو ید بیضاء حاصل ہے۔ان میں سے (سید) امیر علی ہیں جنہوں نے انگریزی میں مستند کتب تالیف کر کے حقیقتِ اسلام کو جیسا چاہئے تھا، بیان کیا ہے۔ان میں مولوی محمد

علی امیر جماعت احمدیہ لاہور بھی ہیں۔ یہ جماعت قادیانی نہیں ہے۔ جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی ہے۔ آپ نے نہایت ہی اعلیٰ درجہ کی تفسیر قرآن انگریزی زبان میں تالیف کی ہے۔ جو اُس ترجمۂ قرآن کے بعد ہے جو انگریزی زبان میں سب سے زیادہ صحیح ثابت ہوا ہے۔ ان میں مولوی صدرالدین برلن کی جدید مسجد کے بانی ہیں۔ جو مسلمش ریویو کی المانوی (جرمن) زبان ہی ادارت بھی کرتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ نے جرمنی کے کئی ایک ادباء اور ادیبات کو قبول اسلام کا شرف عطا کیا۔''

(اخبار پیغام صلح لاہور۔ 21/اکتوبر 1939ء)

انجمن حمایت اسلام لاہور

یہ ہندوپاک کے مسلمانوں کی ایک قدیم ترین انجمن ہے۔ اس کی بنیاد 1885ء میں رکھی گئی۔ اس انجمن نے برصغیر کے مسلمانوں کی مادی اور دینی ترقی اور فلاح و بہبود کے بہت سارے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ہیں۔ اس کے آفیشل آرگن ''انجمن حمایت اسلام'' میں بھی حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمہ قرآن و تفسیر پر ایک مبسوط تبصرہ چھپا ہے۔ جس کا خلاصہ اخیر کی اِن دوسطروں میں آجاتا ہے:

''مولانا محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمۃ القرآن میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک ترجمہ میں ہونی چاہئیں۔ اس ترجمۃ القرآن کی زبان غایت درجہ سلیس اور شستہ ہے۔'' (رسالہ ''انجمن حمایت اسلام'' لاہور۔ 12 ستمبر 1935)

ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم

ان کے بارے میں خود ان کے استاذ المکرّم مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا یہ بیان ہے۔

''میں نے اس کی تحریروں سے یہ اندازہ کیا ہے کہ یہ محمد علی لاہوری (قادیانی) کے ترجمہ قرآن اور قادیانیوں کے نظام سے بہت متاثر ہے۔ (یہ امر واضح ہے کہ) اس نے اپنے رسالہ میں قادیانیوں کی خدمتِ قرآن کی تعریف کی

ہے۔'' (رسالہ ''میثاق'' اگست 1978ء۔ص۔7)

ڈاکٹر صاحب موصوف کا لاہوری احمدیوں کے متعلق ذاتی فتویٰ یہ ہے:۔

''قادیانیوں کا معاملہ صاف ہوتو بھی لاہوری احمدیوں کا معاملہ اس قدر صاحب نہیں ہے۔ چونکہ وہ مرزا غلام احمد صاحب کو صرف ایک مجدد مانتے ہیں۔ اور اس بناء پر انکی تکفیر کسی طرح صحیح نہیں''

(کتاب ''تحریک جماعت اسلامی۔ایک تحقیقی مطالعہ''۔ص190، ڈاکٹر اسرار احمد)

مولانا عبدالمجید خان ایڈیٹر رسالہ ''مولوی''

''ایک ترجمہ مولوی محمد علی صاحب ایم اے امیر جماعت احمدیہ نے کیا ہے۔ جو بڑے اہتمام کے ساتھ 1917ء میں انجمن احمدیہ لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ ترجمہ ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے۔'' (ماہنامہ ''مولوی'' جمادی الثانی 1366ھ)

علامہ رحمت اللہ طارق

علامہ رحمت اللہ طارق عصر حاضر کے ایک بہت بڑے قرآنی سکالر ہیں۔ قرآنی علوم قدیمہ وجدیدہ پر اُن کی بڑی گہری نظر ہے۔ جو بھی لکھتے ہیں پوری چھان بین اور محققانہ ریسرچ کے بعد ہی لکھتے ہیں۔ ان کی تشریحات اور بیان علی العموم بے لاگ اور غیر جانب دارانہ ہوتے ہیں۔ بہت ساری اعلیٰ پایہ کی تصنیفات کے مصنف ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اور مقبول ''تفسیر منسوخ القرآن'' ہے۔ یہ کتاب ''ناسخ ومنسوخ'' والے مسئلے پر حرف آخر کہلانے کی حقدار ہے۔ کیونکہ اس میں اُن پانچ سو آیات پر مدلل بحث ہے جن کو بدقسمتی سے منسوخ مان لیا گیا تھا۔ امام سیوطیؒ پانچ سو کی تعداد کو کم کر کے بیس تک لے آئے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس تعداد کو مزید گھٹا کر پانچ کر دیا اور لکھ دیا کہ فقط یہی پانچ آیتیں منسوخ ہیں۔ بانی سلسلہ عالیہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد صاحبؒ اور انکے متبعین نے حضرت شاہ ولی اللہ والی پانچ آیتوں میں بھی تطبیق کر دکھائی اور بتا دیا کہ سارے کا سارا قرآن غیر منسوخ اور واجب العمل ہے۔ احمدیہ لٹریچر میں مسئلہ ''ناسخ منسوخ'' پر خاصا مواد پہلے سے دستیاب ہے۔ لیکن علامہ رحمت اللہ طارق کا طرہ امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ''مسئلہ ناسخ منسوخ'' کی پوری تاریخ یکجا کر دی ہے۔

طارق صاحب کی ایک اور غیر معمولی اور قابل قدر تالیف ''تفسیر برہان القرآن'' ہے۔ کتاب کے سرورق پر تعارفی رنگ میں یہ عبارت درج ہے:۔

''یعنی اس حقیقت کے اظہار میں کہ قرآن کریم کی آیات میں کوئی تضاد یا تناقض نہیں۔ بعض مزعومہ دلائل وتصورت کی انقلاب آفرین تحقیق۔''

سرورق ہی پر کتاب کے مندرجات کی یہ تفصیل ملتی ہے:۔

''جس میں عربی زبان وادب کے قدیم وجدید علماء اور محققین اور ماہرین لغت عربی کی تحقیق وتدقیق کے تناظر میں قرآن محکم کے ان سینکڑوں واضح ومتعین فیصلوں کے تفصیلی تجزیئے ہیں۔ جنہیں بعض فقہا اور محدثین نے اپنے خودساختہ عقائد یا تصورات کے خلاف پاکر کالعدم قرار دے دیا تھا۔ قرآن کریم کے محکم ہونے اور تضاد وتناقص نیز شائبہ تنسیخ سے یکسر پاک ہونے کے مسئلے میں برہان قاطع مطالب قرآنی کی تفہیم اوراحکام قرآن کی جوہری تشخیص میں انسانی جہد وتحقیق کالازوال شاہکار۔''

اس شاہکار میں محترم طارق صاحب نے حضرت مولانا محمد علی کو مصر کے مفتی محمد عبدہ اور امام الھند مولانا ابوالکلام آزاد کے ہم پایہ ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی مایہ ناز تفسیر ''بیان القرآن'' میں ایسے ایسے اعتراضات کا مدلل اور مسکت جواب دے دیا ہے۔ جو ہمارے مفسرین کو نظر ہی نہیں آتے۔ کتاب میں طارق صاحب حضرت مولانا محمد علی کو محقق محمد علی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ بعض جگہ ان کی رائے کو سب پر فائق بھی مانا ہے۔

طارق صاحب کو یہ معلوم تھا کہ مولانا محمد علی صاحب احمدؑ یہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے امیر تھے جو عام معاصر علماء کی نظر میں کافر بلکہ اکفر ہیں۔ اس کے باوجود طارق صاحب نے مولانا محمد علی کے علم وفضل، فکر وشعور سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ وجہ بتاتے ہوئے علامہ طارق لکھتے ہیں:۔

''میں نے فکر وشعور سے آراستہ لوگوں کے در پر دستک دی اوران سے طالب رہنمائی ہوا۔ اور یہ نہ دیکھا کہ جسے شعور کی امانت ودیعت کی گئی ہے وہ کون ہے۔ کیوں کہ میرے پیش نظر حضرت علیؓ کا یہ زریں مشورہ تھا کہ **لاتنظروا الی من قال بل انظروا الی ماقال.** کہنے والے کو مت دیکھو اس کے کہے پر نظر رکھو۔ اس طرح یہ مشورہ سچی رہنمائی کرتا ہے۔ کہ یہاں پسند وناپسند ذاتی مسئلہ بن جاتا ہے۔

اور طے کردہ نظریات والے ہرگز نہ چاہیں گے کہ جن کو وہ پسند نہیں کرتے ان کے حوالے سے بات چلائی جائے۔لیکن کیا وحی الٰہی ان کی مفلوج سوچ کی تائید کرتی ہے۔قرآن فرماتا ہے۔لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ۔(یعنی) کسی گروہ کی ذاتی پرخاش یا اس سے نفرت کا جذبہ تمہیں ایسا نہ کرنے دے کہ تم تعصب اور مخالفت کی راہ چل پڑو اور اس طرح حق وانصاف کا دامن چھوڑ بیٹھو(نہیں)تم حق وانصاف کا ساتھ دو (خواہ کہیں بھی ہو) کہ خود حفاظتی اور تقوی کا صرف یہی ایک راستہ ہے(مفہوم از مائدہ۔۸تا۹) اسی طرح نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے۔الحکمة ضاله المومن حیث وجدها اخذها ۔حکمت یعنی جو ہر فرزانگی مومن کی میراث ہے وہ اسے جہاں پائے حاصل کرلے(الحدیث)۔یہاں حیث کا لفظ مکان اور شخصیت کا ظرف ہے۔یعنی جس سے اور جہاں سے حکمت کے موتی ملیں انہیں لینے میں تامل نہ کرنا چاہیئے مکہ ہو یا ہردوار۔گوتم بدھ ہو یا مسیح علیہ السلام "حیث" کا لفظ سب کو شامل ہے۔نیز فرمایا۔ خذ ما صفا ودع ما کدر ۔ستھرا ستھرا لے لو اور گدلا گدلا چھوڑ دو۔"

یہاں علامہ طارق نے ایک فٹ نوٹ لکھا ہے۔جو ہر لحاظ سے سبق آموز اور قابل دید ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

"(نفرت اور تعصب والی سوچ کے حامل حضرات بھی) بے نیاز نہیں رہ سکتے۔اہل حدیثوں کے متکلم اور مایۂ ناز عالم مولانا حنیف ندوی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

"محمد اسد نے انگریزی زبان میں قرآن کے میسج اور پیغام کو اچھی طرح واضح کیا ہے۔اور اس میں اُن تمام شکوک وشبہات کو دور کیا ہے۔جو مغربی ذہن میں قرآن فہمی کے سلسلے میں ابھرتے اور کھٹکتے ہیں۔ان کی یہ کوشش اس لحاظ سے تحسین کے لائق ہے کہ اس نے ہمیں مولانا محمد علی لاہوری کے ترجمہ قرآن سے یکسر بے نیاز کردیا ہے۔"

(مقدمہ ترجمان القرآن از ندوی طبع اسلامی اکیڈیمی لاہور۔جلد 3/12،1 تا 3 نوشتہ 14.3.1982)

یہاں اِن کو اعتراف ہے کہ مولانا محمد علی سے نفرت ہی سہی تاہم محمد اسد سے پہلے اُن

کے ترجمہ قرآن کی اہمیت واضح تھی۔اور ہم اُس سے بے نیاز نہ ہو سکتے تھے۔''

(برہان القرآن۔ص102 تا103)

علامہ طارق ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''محمد علی (1951م) جن سے ہم نے کہیں بھی تعصب کا مظاہرہ نہیں کیا اور بلا خوف لومہ لائم ان کی علمی تحقیقات کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ کیونکہ ہم نے اس اصول پر کاربند رہنے کا عہد کرلیا تھا کہ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا (مائدہ:۹)۔ لہٰذا ہم انصاف کو خویش و بیگانہ کے گھٹیا جذبات سے نہیں تولتے۔۔۔۔محترم کی فکر رسا سے انکار نہیں۔اس ضمن میں ان کے دلائل کی اہمیت بھی روز روشن کی طرح واضح ہے۔''

(برہان القرآن۔ص214)

ایک اور مثال

آگے بڑھنے سے پہلے ہم نظریاتی عصبیت اور فرقہ وارانہ تنگ نظری کی ایک اور مثال ہدیہ قارین کرنا چاہیں گے۔ یہ مثال ہمیں محترم غلام احمد پرویز کے ''مطالب الفرقان'' جلد 4 کے صفحہ 149 سے دستیاب ہوئی۔ملاحظہ فرمائیں:۔

''مولانا عبدالماجد دریابادی (مرحوم) نے قرآن کریم کا انگریزی زبان میں ترجمہ اور تفسیر شائع کی۔تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے دہلی کے ماہنامہ ''برہان'' نے اپنی مئی 1958ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں (''سنی ترجمہ قرآن'') عنوان کے تحت لکھا۔

'' انگریزی زبان میں قرآن مجید کے متعدد تراجم پہلے سے موجود ہیں اور جہاں تک زبان کا معاملہ ہے ایک سے ایک اچھے ہیں۔لیکن پھر بھی ایک ایسے ترجمہ کی ضرورت تھی جس کو اہل سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔اور جس میں قرآنی حقائق و معارف پر صحت عقیدہ و خیال کے ساتھ اسلامی روایات اور جدید معلومات دونوں کی روشنی میں کلام کیا گیا ہو۔بحمد اللہ اس تفسیر سے یہ ضرورت بڑی خوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔'' (بحوالہ طلوع اسلام، بابت جولائی 1958)

آپ سوچئے کہ اپنے عقائد اور نظریات کے تابع قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر ''اگر کھلا

ہوا شرک'' نہیں تو اور کیا ہے؟'' (مطالب الفرقان۔ج4۔صفحہ۱۴۹)

اتنا سب کرنے کے باوجود ندوہ کے سربراہ مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس بات کا افسوس ہی رہا کہ اس تفسیر کو وہ قبولیت نہ مل پائی جو بقول اُن کے اس کا حق تھا۔ یاد رہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے انگریزی ترجمہ کا پیش لفظ مولانا علی میاں ندوی ہی نے لکھا ہے۔ قارین کرام کو یہ جان کر ضرور حیرانی ہوگی کہ کتابیات والے حصے میں مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا محمد علی جوہر کا نام بطور خصوصی درج تو کیا ہے لیکن اُس محسن کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا جس نے انہیں ملحد سے مسلم اور مسلم سے مفسر بنایا تھا۔

ایک اشد ترین معاند و مخالف کا اعتراف حق

''لاہوری جماعت ۔۔۔نے اشاعت اسلام کا ٹھوس کام قادیانیوں کی نسبت کہیں زیادہ کیا ہے۔۔۔مولوی محمد علی صاحب نے قرآن کرم کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔اور اردو میں تین جلدوں پر مشتمل ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔انگریزی ترجمہ اُس زمانہ کے لحاظ سے بہت اہم تھا۔کیوں کہ غالباً اُس وقت تک ایک غیر مسلم مصنف کے سوا کسی نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ نہ کیا تھا۔اور مولوی صاحب کا یہ اجتہاد بھی قابل ستائش ہے۔کہ انہوں نے قرآن کے انگریزی ترجمے کا ایک ایڈیشن بغیر عربی متن کے شائع کیا۔جو ہمارے نزدیک قرآن کو دیگر زبانوں میں منتقل کرنے اور اس کی اشاعت کو بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ان کتب کے علاوہ مولوی صاحب نے صحیح بخاری کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔دو جلدوں کی اس کتاب میں ترجمہ کے علاوہ مفید حواشی بھی درج ہیں۔مولوی صاحب کے تفسیری نوٹوں میں اکثر مقامات کا طرزِ استدلال بہت لوگوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا۔لیکن یہ بات ہر کوئی مانے گا کہ یہ کتابیں نہایت محنت سے اور مکمل تحقیق کے بعد لکھی گئی ہیں اور اسلامی لٹریچر میں ایک مفید اور خیال آفرین اضافہ ہیں۔''

(احمدیہ تحریک۔محمد جعفر خاں۔سندھ ساگر اکادمی۔لاہور۔ص۳۱۳)

حضرت علامہ مولانا محمد علیؒ کی
انگریزی تفسیر قرآن اور اُردو ''بیان القرآن''
(بحیثیت دو پیش رو تفسیریں)

علامہ یوسف علیؒ

ان کی انگریزی تفسیر کا تفصیلی ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ جہاں ہم دکھا چکے ہیں کہ علامہ یوسف علی نے کس حد تک حضرت مولانا محمد علی سے براہ راست استفادہ اور انکی مایہ افتخار انگریزی تفسیر کا اتباع کیا تھا۔ یہاں علامہ یوسف علی کے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچے کے ایک مختصر اقتباس پر اکتفا کی جاتی ہے۔ علامہ موصوف حضرت مولانا محمد علیؒ کی شاہکار انگریزی تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں۔

> ''احمدیوں کی لاہور انجمن نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ شائع کیا ہے (پہلا ایڈیشن 1917ء)۔ مولوی محمد علی صاحب کے اس ترجمے کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ یہ ایک نہایت ہی عالمانہ تصنیف ہے، جس میں مناسب تشریحی حواشی خاصی مقدار میں ہیں۔ اخیر پر ایک مکمل اشاریہ بھی شامل ہے۔''
>
> (دیباچہ۔ص xv۔جلد اوّل)

الحاج حافظ غلام سرورؒ

اِن کا رواں تفسیری ترجمہ 1929ء کے قریب لندن سے شائع ہوا۔ اس انگریزی ترجمۃ القرآن میں فٹ نوٹ نہیں۔ تشریحی عبارتوں کو ترجمہ کے درمیان بریکٹوں میں رکھا گیا ہے۔ بقول علامہ یوسف علی اس ترجمہ کو وہ مقام حاصل نہ ہو پایا جس کا یہ حقدار تھا۔ حافظ سرور صاحب نے

حضرت مولانا محمد علی کی انگریزی تفسیر قرآن کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کو ہم پیچھے درج کر آئے ہیں۔اعادہ کی ضرورت نہیں۔

جناب محمد مارماڈیوک پکتھالؒ

ان کا ترجمہ 1931ء میں معرض شہود میں آیا۔مسٹر پکتھال نے 1919ء میں احمدیوں کے شہرہ آفاق ووکنگ مسلم مشن لندن میں اسلام قبول کیا تھا۔کچھ عرصہ وہاں بطور امام بھی کام کیا۔ 'معلوماتِ قرآن' کا مصنف لکھتا ہے:۔

''پکتھال اپنی زبان کا ادیب اور اہل قلم تھا۔اس کی زبان کی خوبی وشستگی کا کیا کہنا۔اصلی قرآن کی جاذبیتِ زبان وبیان ایک حد تک ترجمے میں منتقل ہوآئی ہے۔ البتہ اس میں حاشیئے برائے نام ہی ہیں۔تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس ترجمے کو پڑھ کر اطمینان کی سانس لی۔اور کہا کہ اب جا کر ہم اس قابل ہوئے کہ اپنی کتاب دوسروں کے ہاتھ دے سکیں۔'' (معلومات قرآن۔ص187)

تنگ نظر علماء کی ناراضگی کے پیش نظر مولانا محمد مارماڈیوک پکتھال نے اپنے ترجمہ میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ انہوں نے اس ترجمہ کی تیاری میں مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن سے استفادہ کیا ہے،سوائے ایک حاشیہ کے جس میں ضمناً مولانا محمد علی کا نام آ گیا ہے۔ لیکن جب مشہور مستشرق اور عربی زبان کے ماہر پادری زویمر نے مارماڈیوک پکتھال کے ترجمہ کا مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن سے موازنہ کیا تو اپنے رسالہ ''مسلم ورلڈ'' میں یہ رائے ظاہر کی :۔

''جب ہم نے مولانا محمد علی ،مسٹر مارماڈیوک پکتھال اور حافظ غلام سرور صاحب کے تراجم کا باہم مقابلہ کیا۔تو دیکھا کہ مؤخرالذکر دونوں اصحاب نے اکثر وبیشتر مولانا محمد علی کے ترجمۃ القرآن کا ہی اتباع کیا ہے۔کہیں کہیں تو فرق بس معمولی الفاظ تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ان دونوں صاحبوں نے مولانا محمد علی کا اس کثرت سے استفادہ کیا ہے کہ ان تراجم کو اوریجنل ورک (Original work)

نہیں کہہ سکتے۔اس استفادہ کی وجہ یہ تھی کہ مولانا کا ترجمہ ایک نہایت وسیع مطالعے اور دقیق ریسرچ پر مبنی تھا۔'' (مسلم ورلڈ، بابت جولائی 1931ء)

مولانا مرزا ابوالفضل

قرآن کریم کے انگریزی تراجم کی تاریخ میں ایک نامقبول سنگ میل، مولانا مرزا ابوالفضل کا انگریزی ترجمۃ القرآن پہلی بار 1914ء میں شائع ہوا۔ مرزا صاحب موصوف نے اس ترجمہ میں قرآن پاک کی موجود ترتیب کو چھوڑ کر امام سیوطی اور جرمن مستشرق نولڈیکی (Noldeke) کی بتائی ہوئی مفروضہ نزولی ترتیب اپنائی تھی۔ پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں مترجم صاحب نے یہ بھی لکھا ہے:۔

''آخر پر میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا پورا احساس ہے۔ کئی نقائص ایسے ہیں جن کو میں اگلے ایڈیشن میں دور کر دینا چاہوں گا۔ تب تک اس ترجمہ کو ایسے ہی پیش کیا جا رہا ہے۔ موجودہ صورت میں بھی یہ کچھ قاریوں کے لئے حکمت الٰہیہ سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا۔''

وفات سے پہلے جناب مرزا ابوالفضل نے 1955ء میں قرآن کریم کا ایک نیا ترجمہ شائع کیا۔ اس بار سورتوں کی نزولی ترتیب کو چھوڑ کر مروجہ متداول ترتیب ہی کو اختیار کیا ہے۔ دیباچہ میں مرزا ابوالفضل لکھتے ہیں:۔

''میرے سابقہ 1916ء کے ایڈیشن کے بعد قرآن پاک کے کچھ شاندار انگریزی تراجم معرض وجود میں آ چکے ہیں۔ ایک تو مولانا محمد علی ہی کا ہے اور دوسرا مسٹر عبداللہ یوسف علی کا۔ عالم فاضل ہونے کے باوجود مسٹر عبداللہ یوسف علی نے متقدمین کی تفسیری آراء ہی کا اتباع کیا ہے۔ اس کے برعکس مولانا محمد علی جامد تقلید اور پیروی کے معاملے میں خاصے آزاد خیال ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے موجودہ ترجمۃ القرآن کی تیاری میں ان دونوں اصحاب سے کافی استفادہ کیا ہے۔ جس کے لئے میں ان کا مرہون منت ہوں۔ کہیں کہیں میں نے ان سے اختلاف

رائے بھی کیا ہے۔'' (ابوالفضل، یکم جنوری 1955ء)

مرزا صاحب کے اس ترجمہ میں قرآنی متن شامل نہیں۔ سارے ترجمہ میں آجا کے ایک ہی فٹ نوٹ ہے۔ بدقسمتی سے وہ بھی اپنی صحیح جگہ چھپ نہ سکا۔ اس کو Corrigendum & Addendum کے طور ترجمہ کے بالکل آغاز میں رکھ دیا گیا ہے۔ یہ عالی خیال تحقیقی نوٹ اس قابل ہے کہ ہم اسے اپنے معزز قارئین کی خدمت میں پیش کریں:۔

ترجمہ: ''برائے کرم (سورت نمبر 23 کی) آیت 50 کو یوں پڑھا جائے:

''ہم نے مریم کے بیٹے اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا۔ اور انہیں ایک ایسی بلند سرزمین پر پناہ دی جہاں میوؤں کی افراط ہے اور نہریں جاری ہیں۔''

(یہ ترجمہ مرزا ابوالفضل کی قرآنی لغت 'غریب القرآن' سے لیا گیا ہے۔ خورشید)

حاشیہ۔ ''ایسا لگتا ہے کہ صلیب دیئے جانے اور دوبارہ جی اٹھنے کے نام نہاد واقعہ کے بعد حضرت عیسیٰؑ مالی کے بھیس میں چھپ کر وقت گزارنے لگے۔ چالیسویں دن وہ اپنے ظالم وطن مالوف سے والدہ ماجدہ کے ساتھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اور اُس سرزمین میں پناہ گزیں ہوئے جس کا ذکر متذکرہ بالا آیت میں ہے۔ جہاں انہوں نے حدیث نبویؐ کے مطابق ایک لمبی یعنی 125 سال کی عمر پائی۔ (جو قاری حضرت عیسیٰؑ کے ہندوستان کی طرف سفر سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُسے چاہئیے کہ وہ روسی سیاح ایم ناٹووچ (M.Notovitz) کا 'سیاحت نامہ' پڑھے، جس میں وہ ہیمس (لداخ) کے بدھ گھمپا میں ایسے تاریخی شواہد کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ جس کا تعلق زیر بحث موضوع سے ہے۔''

''غریب القرآن'' میں رَبْوَۃ لفظ کے تحت یہ عبارت آئی ہے:۔

''ایسی بلند سرزمین میں جہاں میوؤں کی افراط ہے اور نہریں جاری ہیں۔ یہ بیان ہے اس سرزمین کا جہاں صلیبی کارروائی کے بعد حضرت مسیح اور ان کی والدہ ماجدہ کو پناہ ملی۔ مولوی محمد علی اپنے ترجمہ قرآن مجید میں یہ مقام کشمیر کو قرار دیتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ آنجناب کے تاریخی حالات بھی اسی کے معاون ہیں۔''

(غریب القرآن۔ از مرزا ابوالفضل بن فیاض علی)

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد (وفات۔1958)

ان کی مشہور تفسیر ''ترجمان القرآن'' (1931ء) کے بارے میں مؤرخ اسلام علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام صاحب (ڈی،لٹ) کا یہ تاریخی ریمارک قابل دید ہے:۔

''گذشتہ ربع صدی میں انگریزی خوان طبقے کو قرآن سے زیادہ دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب مولانا محمد علی کا ''ترجمۃ القرآن'' ہے۔ آج مولانا ابوالکلام آزاد نے مطالب قرآنی کو واضح کرنے کے لئے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس کا نمونہ مولوی محمد علی نے اب سے پچیس سال پہلے پیش کر دیا تھا۔''

(موج کوثر۔ص105۔طبع اوّل)

مولوی اور تنگ نظر علماء کی مخالفت اور برہمی کے خوف سے مولانا آزاد والا جملہ مابعد کے ایڈیشنوں سے نکال دیا گیا ہے۔لیکن آنکھیں بند کر لینے سے سورج کا اُجالا ختم نہیں ہو جاتا۔ متقدمین کی تفاسیر میں دو بڑے نقص تھے،جن کو خود ہمارے راسخ العقیدہ علماء بھی تسلیم کرتے ہیں۔ ایک اسرائیلیات یعنی غیر معتبر، غیر اسلامی تفسیری روایات کی بھرمار۔ دوسرے روزہ مرہ کے سیدھے سادے واقعات کو بلاوجہ خرق عادت اور معجزہ بنانا اور پھر اپنی بات کو قائم رکھنے کے لئے بے سروپا، بعید از عقل وقیاس، قصے اور کہانیوں کا سہارا لینا۔ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی اس نامناسب اور غیر واجب رائے کو حتمی اور قطعی قرار دے کر قرآن جیسی روشن اور پر حکمت کتاب کو ہیٹا ٹھہرانا۔مولانا محمد علی نے اپنی مایۂ ناز تفسیر ''بیان القرآن'' کو اِن دونوں نقائص سے پاک رکھا۔ باایں ہمہ مولانا محمد علی نے کبھی بھی کسی ایسی خرقِ عادت بات یا معجزہ کا انکار نہیں کیا جو قرآن کے صریح ارشادات اور نبی آخر محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ ﷺ (فداہ امی وابی) کے واضح فرمودات سے ثابت ہو۔جن امور میں مفسرین عظام کے یہاں پہلے ہی سے اختلاف ہو، وہاں کسی خاص رائے کو فوقیت دینا یا کسی جدید رائے کو پیش کرنا گناہ نہیں۔ نہ اس کو محل اعتراض بنایا جا سکتا ہے۔اسی نہج کو مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ''ترجمان القرآن'' میں اپنایا ہے۔کچھ مثالیں حاضر ہیں:۔

ذوالقرنین کی تاریخی تحقیق

''ذوالقرنین کی تعین اور تشخیص میں پندرہ سو برس کا تمام تفسیری لٹریچر مختلف احتمالات اور اندازے پیش کرنے پر اکتفا کرتا رہا ہے۔ اور اگر کسی قول کو ترجیح دی گئی تو وہ علامہ ابن کثیر دمشقی (وفات 774ھ/1372ء) کی تحقیق ہے۔ جس میں ذوالقرنین وہ سکندر ہے جسے حضرت ابراہیمؑ کی معاصرت حاصل ہے۔ حضرت محدث کشمیریؒ نے بھی شارح بخاری علامہ عینی کے حوالہ سے اسی رائے کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے اس تحقیق سے گریز کیا ہے۔ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے 1925ء میں علامہ ابن کثیر ہی کی رائے کو ترجیح دی ہے۔ اور یاجوج ماجوج کے بارے میں یہ عجیب بات لکھی ہے۔ ''میرا خیال ہے یاجوج ماجوج کی قوم انسانوں اور جنّات کے درمیان ایک برزخی مخلوق ہے۔''
(حمائل۔ص393)

مولانا محمد علی لاہوری نے اپنی تفسیر ''بیان القرآن'' (1922) میں تمام قدیم توجیہات سے ہٹ کر دانیالؑ نبی کے خواب پر توجہ کی اور بائبل کے اشارہ سے فارس کے شہنشاہ دارائے اوّل کو قرآن کا ذوالقرنین بتایا۔ دارائے اوّل سائرس کا دادا تھا۔ اور یا جوج ماجوج عیسائی قوموں کو قرار دیا۔ (جلد دوم۔ص1191)۔ قدیم تحقیقات سے ہٹ کر فارسی حکمران دارائے اوّل کی طرف یہ پہلا تحقیقی اشارہ تھا۔ اس اشارہ کو مکمل تحقیق اور نشاندہی تک پہنچانے کا سہرا مولانا آزادؔ کے سر ہے۔''

(مولانا آزاد کی قرآنی بصیرت۔ص208۔ مؤلفہ مولانا اخلاق حسین قاسمی)

حضرت ابراہیمؑ اور پرندے

قرآن کریم فرماتا ہے:۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ط قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ط قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ط قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ

اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ط وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ. (البقرہ۔آیت260)

''اور جب ابراہیم نے کہا: اے میرے رب! مجھے دِکھا تو کس طرح مُردوں کو زندہ کرتا ہے۔کہا! کیا تو نے نہیں مانا؟ کہا: ہاں! مگر اس لئے کہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو۔کہا تو چار پرندے لے۔ پھر انہیں اپنے ساتھ ہلا لے۔ پھر ان میں سے ایک ایک حصہ ہر ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو بلاؤ، تیرے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے اور جان لے اللہ غالب حکمت والا ہے''۔(ترجمہ محمد علیؒ)

مثال بالکلصاف اور واضح ہے۔اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو کہا کہ چار پرندے لو، اُن کو اپنے ساتھ ہلا لو، پھر ان کو ایک ایک کر کے چار مختلف سمتوں میں رکھ دو۔ پھر بلاؤ۔تو وہ تمہاری آواز پر بھاگے چلے آئیں گے۔مطلب یہ کہ جب ایک پرندہ جو انسان سے بہت دور رہنے والی چیز ہے، لیکن انسان اسے ہلا لے تو یہاں تک اُسے اپنے حکم کے تابع کر سکتا ہے کہ وہ اس کی آواز پر فوراً اُڑا چلا آتا ہے۔اللہ تعالیٰ تو خالق و مالک ہے، اس کا تصرف مخلوق پر کیوں اس سے بڑھ کر نہ ہو۔قدامت پرست مفسرین نے اس سیدھی سادی آیت کو کچھ کا کچھ بنا دیا:۔

''اور جب ابراہیم نے (خدا سے) کہا اے پروردگار! مجھے دکھا کر تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں؟ لیکن (میں دیکھنا) اس لئے (چاہتا ہوں) کہ میرا دل اطمینان کامل حاصل کر لے۔ خدا نے فرمایا کہ چار جانور پکڑوا کر اپنے پاس منگا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کرا دو) پھر ان کا ایک ایک ٹکڑا ہر ایک پہاڑ پر رکھوا دو۔ پھر ان کو بلاؤ تو وہ تمہارے پاس دوڑتے چلے آئیں گے۔ اور جان رکھو کہ خدا غالب اور صاحب حکمت ہے۔''(ترجمہ از مولانا تھانویؒ)

''اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے کہا کہ اے میرے پروردگار! مجھے دکھا تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرے گا؟ (جناب باری تعالیٰ نے) فرمایا، کیا تمہیں ایمان نہیں؟ جواب دیا ایمان تو ہے لیکن میرے دل کی تسکین ہو جائے گی۔فرمایا

چار پرندلو، ان کے ٹکڑے کرڈالو، پھر ہر پہاڑ پران کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو پھر انہیں پکارو، تمہارے پاس دوڑے ہوئے آجائیں گے اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غالب ہے حکمتوں والا ہے۔''

(ترجمہ مولانا جونا گڑھی۔ یہ ترجمہ مکہ سے شائع ہوا ہے)

''جب ابراہیمؑ نے کہا کہ اے میرے رب تُو کیونکر مُردے کو جِلاتا ہے۔ فرمایا کیا تو ایمان نہیں لایا؟ اُس نے کہا، ایمان تو لایا ہوں لیکن اپنے دل کا اطمینان چاہتا ہوں۔ فرمایا، چار پرندے لے اور ان کو اپنے ساتھ ہلا لے پھر ہر پہاڑ پر اُن کے گوشت کا ایک ایک ٹکڑا ڈال دے۔ پھر اُن کو پکار۔ وہ تیرے پاس دَوڑتے آئیں گے۔ اور جان لے کہ اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

(ترجمہ۔ محمد حنیف ندوی)

آیت کریمہ میں قیمہ بنانے یا ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔ صُــر کے بعد جب اِلٰـــــی آئے تو معنی صرف اور صرف مائل کرنے یا زیادہ سے زیادہ سدھا کر ہلا ملا لینے کے ہوں گے۔ یہ بات مولانا محمد علی کہیں تو مرزائیت، مولانا آزاد کہیں تو قرآن شریف کی صحیح ترجمانی؟ مولانا آزاد کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اور پھر (دیکھو) جب ایسا ہوا تھا کہ ابراہیم نے کہا تھا۔ اے پروردگار! مجھے دکھلا دے، کس طرح تو مُردوں کو زندہ کردے گا؟ اللہ نے فرمایا، کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا ضرور ہے لیکن یہ اس لئے چاہتا ہوں تاکہ میرے دل کو قرار آجائے (یعنی تیری قدرت پر تو یقین و ایمان ہے، لیکن یہ جو مایوس کن حالت دیکھ کر دل دھڑکنے لگتا ہے تو وہ بات دور ہو جائے) اس پر ارشادِ الٰہی ہوا، اچھا یوں کرو کہ پرندوں میں سے چار جانور پکڑ لو، اور انہیں اپنے پاس رکھ کر اپنے ساتھ ہلا لو (یعنی اس طرح ان کی تربیت کرو کہ وہ اچھی طرح سے ہل جائیں) پھر ان چاروں میں سے ہر ایک کو (اپنے سے دُور) ایک ایک پہاڑ پر بٹھا دو۔ پھر انہیں بلاؤ۔ وہ (آواز سنتے ہی) تمہاری طرف اُڑتے ہوئے چلے آئیں گے۔ یاد رکھو! اللہ سب پر غالب

اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔''

(ترجمان القرآن، جلد 1 ص، 327 تا 328، مکتبہ سعید، کراچی)

اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

''اور وہ واقعہ بھی پیش نظر رہے، جب ابراہیم نے کہا تھا کہ ''میرے مالک! مجھے دکھادے، تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے''۔ فرمایا: کیا تو ایمان نہیں رکھتا؟ اس نے عرض کیا، ایمان تو رکھتا ہوں، مگر دل کا اطمینان درکار ہے۔ فرمایا: اچھا، تو چار پرندے لے اور ان کو اپنے سے مانوس کرلے۔ پھر ان کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے۔ پھر ان کو پکار وہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لے کہ اللہ نہایت با اقتدار اور حکیم ہے۔''

(تفہیم القرآن۔ جلد اول۔ ص ۲۰۱ و ۲۰۲)

اصحابِ کہف کون تھے؟

مفسرین کہتے ہیں کہ یہ کچھ نوجوان تھے، جو حضرت عیسیٰؑ کے مذہب پر تھے۔ اُس دَور کے بادشاہ ڈیسئس یا دقیانوس کی ایذا رسانی سے تنگ آکر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے۔ اطلاع ملنے پر بادشاہ نے غار کے سامنے دیوار بنوادی اور دوسو سال سے لیکر کوئی چار سو سال تک اسی غار میں سوئے رہے۔ پھر جب جاگے تو اس وقت رومن امپائر میں عیسائی مذہب کا دور دورہ تھا۔ اس لئے ان کی اطلاع ملنے پر اس وقت کا بادشاہ خود انہیں دیکھنے گیا اور بعض روایات میں ہے کہ اسنے انہیں دیکھا اور بعض کے مطابق ان کا پتہ نہ ملا۔ یہ لوگ سال میں ایک بار یا چھ ماہ میں ایک کروٹ لیتے تھے۔ ان کی آنکھیں نیند میں بھی کھلی رہتی تھیں۔ ان کیساتھ کتا بھی تھا، جو اس عرصہ چوکھٹ پر پیر پسارے پہرہ دیتا رہا۔ سویا نہیں، اُسے غذا اپنے ہاتھ چاٹنے سے پہنچ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں اور زوائد اس قصے کے ساتھ جوڑ دیئے گئے ہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ کہف کی ابتدائی دس اور آخری دس آیتوں کو دجال سے متعلق بتایا ہے۔ اور چونکہ دجال کا فتنہ اصل میں عیسائی اقوام ہی کا فتنہ ہے، لہٰذا اس سورت کو

اسی تناظر میں لینا ہوگا۔ جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا انہیں قدم قدم پر مشکلات اور حیرانیوں سے دور چار ہونا پڑا۔ اس گتھی کو سب سے پہلے حضرت مولانا محمد علی نے ہی سلجھایا۔ یہ بات اور ہے کہ قدامت پرست علماء اس پر بھی ناراض ہو گئے۔

حضرت مولانا محمد علی نے دلائل اور تاریخی شواہد کی لمبی بحث سے یہ ثابت کیا کہ اس سورت میں دراصل عیسائیت کی تاریخ کا بیان ہے۔ مولانا موصوف لکھتے ہیں:

''قرآن شریف نے صرف اصحاب الکہف کا نام اختیار کرنے کے بجائے اصحاب الکہف والرقیم فرمایا ہے۔ کیونکہ عیسائت کی تاریخ کا خلاصہ انہی دو الفاظ میں آجاتا ہے۔ یعنی کہف (غار) اور رقیم (تختی) میں۔ عیسائیت کی ابتدائی تاریخ غار سے وابستہ ہے۔ اور اس کی آخری رقیم سے۔ عیسائیت کی پرورش غاروں میں ہوئی نہ صرف اس لئے کہ ابتداء میں اس مذہب کے قبول کرنے والوں کو مظالم سے تنگ آکر غاروں میں پناہ لینی پڑی، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ عیسائیت کا پہلا رجحان رہبانیت کی طرف تھا۔ اور اس لئے عیسائیوں میں جو بڑے بڑے لوگ ہوئے انہوں نے رہبانیت اختیار کر کے غاروں میں ہی اپنے کمال کو حاصل کیا۔ اور دنیا کو بکلی ترک کر کے گوشہ گزینی اختیار کی جس کی طرف لفظ کہف میں اشارہ ہے۔ اور اس مذہب کی آخری حالت ''رقیم'' سے وابستہ ہے۔ یعنی لکھی ہوئی تختیوں سے۔ جو اس قوم کا نمایاں امتیاز ہے کہ نہ صرف ہر زندہ شخص کے نام کی تختی لکھی ہوتی ہے۔ نہ صرف مردہ کی قبر پر لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی تمام تجارتی اشیاء پر بھی ایک لکھی ہوئی تختی ہوتی ہے۔ اور لفظ رقیم کے اختیار کرنے میں اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ''رقیم'' کے معنی کپڑوں پر قیمتوں کا لکھنا بھی ہیں۔ اور تجارتی اشیاء پر قیمتوں کے لکھنے میں اشارہ وسعت تجارت کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ یا ان کے تجارت اور دُنیا میں انہماک کی طرف.....'' (بیان القرآن، جلد 2، فٹ نوٹ 1897)

اب ذرا مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف آئیں۔ مولانا موصوف اپنے ''ترجمان القرآن''

میں لکھتے ہیں:۔

''دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسرین کے پیدا کئے ہوئے تخیّل سے بالکل الگ ہوکر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔''

(ترجمان القرآن۔جلد2۔ص396)

جب یہی بات پچیس برس قبل مولانا محمد علی نے کہی تو اس کو قرآن شریف میں تحریف اور مفسرین کرام سے سرتابی کہا گیا۔اب مولانا آزاد کی تحقیق کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیں:۔

''پھر یہ بات سامنے لانی چاہئے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے۔اور جنہیں پیش آیا وہ عیسائی تھے۔صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہوجاتا ہے۔مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد وانزدا کی ایک خاص زندگی شروع ہوگئی تھی۔جس نے آگے چل کر رہبانیت (مناسٹک ازم) کی مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترک علائق کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشہ میں معتکف ہوجاتے تھے ۔۔۔۔۔۔''(ایضاً)

حضرت ابراہیمؑ اور تین جھوٹ

ویسے تو حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بولنے کے عادی نہ تھے۔لیکن بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق تین جھوٹ انہیں بھی بولنا ہی پڑے۔جن میں دو جھوٹ اللہ کے لئے تھے اور ایک اپنی ذات کیلئے۔ایک جھوٹ تو یہ تھا کہ مندر کے بتوں کو خود توڑا مگر دریافت کرنے پر کہہ دیا کہ یہ کام بڑے والے بت نے کیا ہے۔دوسرا یہ کہ جب لوگوں نے کسی قومی تقریب میں شمولیت کے لئے کہا تو تندرست ہوکر بھی کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں اس لئے نہیں چل سکتا۔

(بخاری حدیث نمبر 3358,3351 خلاصہ)

اس حدیث میں راوی تیسرے جھوٹ کا ذکر نہیں کرتا۔تمام انبیاء کرام علیہم السلام، بنا کسی استثناء، معصوم عن الخطا ہیں۔انبیاء کی پاکیزگی اور معصومیت قرآن کریم کی نص صریح سے ثابت

ہے۔عقیدۂ مسلمان بھی اسی بات کے قائل ہیں ۔لیکن بدقسمتی سے ہمارے اسلاف نے اپنی تفاسیر میں ایسی روایات کو جگہ دے دی ہے جو عقیدۂ عصمتِ انبیاء کے سراسر مخالف ہیں۔ستم بالائے ستم، ان میں سے بعض باتیں احادیث میں بھی راہ پا گئی ہیں۔ان غیر اسلامی اور غیر قرآنی نظریات کے خلاف آواز بلند کی جائے تو ہر دور میں ایک ہی جواب ملتا رہا ہے:۔

''کیا ہم اُن عالی مرتبہ اکابر مفسروں نیز عادل وثقہ راویوں کو جھوٹا کہیں جنہوں نے یہ خبر فراہم کی ہے؟''

اصول تفسیر پر بحث

حضرت مولانا محمد علیؒ نے 'بیان القرآن' کی تمہید ہی میں اصول تفسیر پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

''میں نے جن اصول کو مدنظر رکھا ہے وہ یہ ہیں ۔اوّل یہ کہ قرآن کریم کے ایک موقعہ کا حل دوسرے موقعہ سے کیا جائے اور یہ اصول خود اس پاک کتاب نے بتایا ہے۔ جہاں متشابہات کے ذکر میں **کل من عندربنا** فرما کر بتادیا کہ ایک مقام کی تفسیر قرآن کریم کے دوسرے مقام کے خلاف نہیں ہونی چاہئے ۔ جہاں تک میں نے اس پاک کتاب پر غور کیا ہے یہی معلوم ہوا ہے کہ کوئی مضمون اس میں ایک جگہ بطور اشارہ یا برنگ اجمال ہے تو دوسری جگہ اس کی وضاحت اور اس کی تفصیل موجود ہے۔اور اس بات نے مجھے بہت سے مشکل مقامات کے حل کرنے میں مدد دی ہے۔ اور جہاں معنی میں اشتباہ واقع ہو وہاں سب سے بڑھ کر خود قرآن پاک اس اشتباہ کو دور کرتا ہے۔دوسری بات یہ مدنظر رکھی ہے کہ احادیث صحیحہ کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے۔اس غرض کے لئے میں نے امام بخاری کی کتاب التفسیر، تفسیر ابن جریر اور تفسیر ابن کثیر کو سامنے رکھا ہے۔لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے۔یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح ستہ سے ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔ دوم تفاسیر میں بہت سی اسرائیلی روایات راہ پا گئی ہیں ۔اور ان پر اس قدر اصرار ہو گیا ہے کہ ان کے خلاف اگر کہا جائے تو بعض لوگ ناواقفی سے یہ خیال کر لیتے ہیں کہ حدیث کو ردّ کر دیا گیا۔سوم قصص کی احادیث پر خود محدثین نے وہ تنقید نہیں کی جو اوامر ونواہی کی احادیث

پر کی ہے۔اس لئے حدیث قصص بہت احتیاط سے قبول کرنے کے قابل ہیں۔ چہارم جو باتیں احادیث میں واقعات یا مشاہدہ یا مسلمہ تاریخ کے خلاف ہوں وہ قابل قبول نہیں۔ اور ان سب امور کے علاوہ یہ بات مدنظر رکھنے کے قابل ہے کہ احادیث بالخصوص احادیث قصص میں روایت بالمعنی ہے۔تیسری بات جس کا میں بالخصوص ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ میں نے (ترجمہ میں) استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔جن معنوں کی اجازت لغات عربی نہیں دیتی ان معنوں کو قبول نہیں کیا۔ صحابہ کے اقوال کی میں بہت عزت کرتا ہوں،لیکن کسی صحابی سے اختلاف کرنا جرم نہیں۔ صحابہ میں خود آپس میں اختلاف تھے۔مفسرین نے بھی ان سے اختلاف کیا ہے اور سب سے آخر اقوال مفسرین کے متعلق اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ ان بزرگوں کی محنت کی، ان کے علم وفضل کی، ان کے عشق قرآن کی میرے دل میں بے حد عظمت ہے۔اور ان کی خدمت قرآن کے سامنے میں اپنی اس ناچیز خدمت کو ہیچ سمجھتا ہوں۔لیکن حالات زمانہ کے اثر سے کوئی شخص خالی نہیں ہوسکتا۔آج اس زمانہ میں نئے علوم نے قرآن کریم کی عظمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔میرے خیالات حالات زمانہ سے متاثر ہوکر غلط ہوسکتے ہیں۔مگر خدا کے کلام کے ایک حرف کو بھی کوئی علم باطل نہیں کرسکتا۔ہاں اپنے زمانہ کے مطابق جو علوم ہوں ان کی روشنی میں ہی ہم جو کچھ خدمت کرسکتے ہیں کرتے ہیں۔

(بیان القرآن،تمہید،ص ب)

جھوٹ نمبر 1 پر مولانا محمد علی کا تبصرہ

قَالُوْا ءَ اَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ. قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ. كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ.

''کہا: اے ابراہیم! کیا تو نے ہمارے معبودوں سے یہ کام کیا ہے؟ اُس نے کہا: بلکہ یہ کیا (جس نے کیا)۔ان کا بڑا یہ ہے،سو ان سے پوچھو اگر وہ بولتے ہیں۔''

(الانبیاء۲۱۔آیت ۶۲۔۶۳)

تشریح : یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ بَلْ فَعَلَه پر وقف ہے اور اسی کو مدنظر نہ رکھنے سے حضرت ابراہیم کی طرف یہ جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے۔ کہ آپ نے خود بت توڑنے سے انکار کیا۔ اور جواب یہ دیا کہ بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑ دیا ہے۔ یہ کہنا کہ اس طرح ان پر الزام دینا مقصود تھا۔ صحیح نہیں اسلئے کہ اس قسم کا الزام تو بغیر جھوٹ کے بھی دیا جا سکتا تھا۔ اور اس معنی کے خلاف اور قرائن بھی ہیں۔ اول حضرت ابراہیم نے علی الاعلان انہیں کہہ دیا تھا لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ (۵۷). یعنی میں (ضرور) تمہارے بتوں کو تکلیف پہنچاؤنگا، اس کے بعد کہ تم پیٹھ پھیرتے ہوئے واپس چلے جاؤ گے۔ مفسرین نے اس صریح خطاب کو جو قوم سے حضرت ابراہیم نے کیا مخفی طور پر کہنا قرار دیا ہے۔ اگر مخفی تھا تو بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا کے کیا معنی ہوئے۔ وہ تو کچھ لوگوں کو خطاب کر کے کہہ رہے ہیں کہ تم پھر جاؤ گے تو میں انہیں نقصان پہنچاؤنگا۔ اور اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو ڈرایا ہوگا کہ اگر تم بتوں کیخلاف کوئی بات منہ سے نکالو گے تو وہ تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا: انہوں نے مجھے کیا نقصان پہنچانا ہے میں (ہی) انہیں نقصان پہنچاؤں گا۔ اور طرز عبارت صاف بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے یہ بات میدان مقابلہ میں کہی ہے۔ اور بہت لوگوں نے اسے سنا ہے۔ اسی لئے جب بہت سے بت ٹوٹے ہوئے پائے گئے اور تحقیقات شروع ہوئی۔ تو بہت سے لوگ بول اٹھے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو یوں کہتے سنا تھا۔ اسی لئے ابراہیمؑ کو بلایا گیا تا کہ سب کے سامنے یہ گواہی دی جائے۔ یہ دوسرا قرینہ اس بات پر ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے فعل کا اخفا نہیں کیا۔ اور اخفا کرنے سے ان کی اصل غرض پوری نہ ہوتی تھی۔ تیسرا اور نہایت قوی قرینہ یہ ہے کہ بڑے بت سے پوچھنے کے لئے نہ حضرت ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ اور نہ پجاری بڑے بت کے متعلق نہ بولنے کا عذر کرتے ہیں۔ بلکہ حضرت ابراہیمؑ بھی کہتے ہیں فَسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ (سوان سے پوچھو! اگر وہ بولتے ہیں۔) اور وہ جواب میں کہتے ہیں۔ مَا هٰؤُلَآءِ

يَنْطِقُوْنَ. (آیت 65۔یعنی یہ بات نہیں کرتے) ۔ اگر بڑے بت کو اس لئے چھوڑا گیا تھا کہ قتل کو اس کی طرف منسوب کیا جائے تو فَسْئَلُوْہ (سو اس سے پوچھ لو) کہنا چاہئے تھا نہ فَسْئَلُوْ ھُم (سو ان سے پوچھو)۔اور وہ بھی جواب میں کہتے کہ یہ بولتا نہیں۔پس وہ صورتِ الزام بھی نہ رہی جو اس جھوٹ کی غرض بتائی جاتی ہے۔انبیاء علیہم السلام کسی مصلحت اور غرض کے لئے کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ان کی سب اغراض اور ان کے سب مصالح سچائی سے پورے ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔''

(بیان القرآن۔ص906۔فٹ نوٹ 2167)

جھوٹ نمبر 2 اور 3 پر تبصرہ

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ. فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ.

ترجمہ۔''تب اس نے ستاروں کو ایک نظر دیکھا۔اور کہا میں تو بیمار ہوں۔''(۳۷:۸۸تا۸۹)

تشریح: اسے مفسرین نے حضرت ابراہیم کے تین جھوٹوں میں سے ایک ٹھہرایا ہے۔حالانکہ (اللہ کی گواہی کہ ابراہیم صَدِيْقاً نَّبِيّاً (مریم 19۔آیت 41) صدیق نبی تھا)۔ان تینوں جھوٹوں کو خود جھوٹا ٹھہراتی ہے۔اور یہ کہنا کہ یہ جھوٹ اللہ کی راہ میں تھے بے معنی ہے۔اللہ کی راہ اور بدی۔یہ دو باتیں جمع نہیں ہوسکتیں۔بدی نہ اللہ کی طرف منسوب ہوسکتی ہے نہ اللہ کی راہ کی طرف۔اگر جھوٹ بولنا برا فعل ہے تو کسی وقت بھی جائز نہیں۔جس طرح چوری کرنا کسی صورت میں بھی جائز نہیں مثلاً اگر ایک بت کے پہنائے ہوئے زیور چرانے جائز نہیں۔خواہ نیت ان کو اچھی جگہ صرف کرنے کی ہی ہو۔تو جھوٹ بول کر بت کا توڑنا بھی جائز نہیں ہوسکتا۔اور ظاہر ہے کہ سَقِيْم سے مراد سَقِيْمُ الْقَلْبِ (دل کی بیماری، دل کی بے زاری) لیکر، جس کی لغت اجازت دیتی ہے۔کوئی دقّت باقی نہیں رہتی۔اور نہ خواہ مخواہ ایک نبی کی طرف جھوٹ منسوب کرنا پڑتا ہے۔''اور ''نجوم'' کی طرف دیکھ کر'' یہ فقرہ بمعنی سَقِيْمُ الْقَلْب اور بھی زیادہ موزون ہے۔اس لئے کہ وہ لوگ نجوم کی عبادت کرتے تھے۔جیسا کہ قرآن شریف میں دوسری جگہ حضرت

ابراہیمؑ کے ساتھ ان کی بحث کا ذکر ہے۔فَلَمَّا... رَاٰ كَوْكَباً قَالَ هٰذَا رَبِّي (الانعام 6 آیت 76۔سو جب اس نے ستارہ دیکھا۔۔۔کہا : کیا یہ میرا رب ہے؟) اور اگر بیمار ہی معنی لئے جائیں تو اس کے جھوٹ ہونے پر کیا دلیل ہے؟ ستاروں کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات بہت چلی گئی ہے۔تب انہوں نے کہا میں بیمار بھی ہوں اور زیادہ نہیں جاگ سکتا۔زبردستی اسے جھوٹ بنانے سے کیا حاصل ہے۔''

(بیان القران۔ص1156۔فٹ نوٹ 2791)

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی رائے

''عام طور پر مفسروں نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین موقعوں پر ایسی بات کی جس پر بظاہر جھوٹ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔اس بارے میں استدلال صحاح کی ایک روایت سے کیا جاتا ہے۔تفسیر قرآن کی تاریخ کی بوالعجبیوں میں اس سے بڑھ کر اور کوئی قابل توجیہہ بوالعجبی نہیں۔قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے اس اصدق الصادقین کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو۔لیکن بہ تکلف ایک آیت کو توڑ مروڑ کر ایسا بنایا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح جھوٹ بولنے کی بات بن جائے اور اثبات کذب کی یہ مبارک کوشش کیوں کی جا رہی ہے؟ صرف اس لئے کہ مزعومہ حدیث موجود ہے۔بس کہیں یہ قیامت نہ ٹوٹ پڑے کہ اس کے غیر معصوم راویوں کی روایت کمزور مان لینی پڑے۔گویا اصل اس باب میں غیر معصوم راویوں کا تحفظ ہے نہ کہ معصوم رسولوں کا۔اور اگر قرآن میں اور کسی روایت میں اختلاف واقع ہو جائے تو قرآن کو روایت کے مطابق بننا پڑے گا۔راوی کی شہادت اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہل سکتی۔'' (ترجمان القرآن۔ص495 تا496)

قرآنی آیات کا سیاق وسباق مدنظر رکھ کر دو تین صفحوں پر ایک لمبی بحث کے بعد خلاصہ یوں پیش کرتے ہیں:۔

''اب غور کرو، اس تمام سرگذشت میں کونسی بات ایسی ہے، جس سے حضرت ابراہیم کا جھوٹ بولنا نکلتا ہو؟ بتوں کو انہوں نے کچھ چوری چھپے نہیں توڑا تھا کہ خلاف

واقعہ بات کہہ کر اُسے چھپانا چاہئے۔تمام پجاریوں کے سامنے صاف صاف اعلان کر دیا تھا۔اور اعلان بھی تاکید کے ساتھ کہ ''**تـالـلـه لاكيدن اصنامكم**''خدا کی قسم! میں ضرور تمہارے بتوں کو اپنے داؤ کا نشانہ بناؤں گا۔ پھر جو بات اس طرح صاف صاف کہہ دی گئی ہو اور اعلانیہ کی گئی ہو۔اس میں جھوٹ بولنے کی بات کہاں سے نکل آئی؟ باقی رہا اُن کا یہ کہنا کہ ''**بـل فعله كبيرهم هذا**'' تو ظاہر ہے کہ ایک لمحہ کے لئے اس سے مقصود انکار فعل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فعل کا تو وہ پہلے اعلان کر چکے تھے اور خود پوچھنے والوں میں ایک ایک فرد جانتا تھا کہ انہی کا کیا دھرا ہے۔ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ محض حجت الزامی تھی اور حجت الزامی کا وہ طریقہ جسے ہمارے مناظر فرض الباطل مع العضم حتی ''ملزمہ الحجتہ'' سے تعبیر کرتے ہیں صدق وکذب کا سوال کیونکر پیدا ہوسکتا ہے؟'' (ترجمان القرآن، جلد۔2،ص499)

پوری بحث نہایت عالمانہ اور مدلل ہے لیکن تنگ دامانی کے پیش نظر ہم سارا بیان نقل نہیں کر سکتے۔ ہاں ''صحت'' اور ''عصمت'' سے متعلق مولانا کی یہ نادر تحقیق وتحلیل ضرور پیش کرنا چاہیں گے:

''تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے راویان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری ومسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے۔ کسی روایت کے لئے بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے۔ وہ اس کی ''صحت'' ہے ''عصمت'' نہیں ہے۔ اور ''صحت'' سے مقصود صحت مصطلحۂ فن ہے۔ نہ کہ صحت قطعی ویقینی مثل صحت قرآن، پس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں۔ لیکن بحرحال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لئے مفید حجت ہوسکتا ہے۔ مگر یقینیات وقطعیات کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ جب کبھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہوجائے گی۔ تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی۔'' (ترجمان القرآن۔ص499 تا500)

جمہور کا خوف اور ذو معنی الفاظ کا استعمال

کچھ غیر اسلامی نظریات اور تفسیری افسانے امت مسلمہ کے ذہن وقلوب میں اس قدر رچ بس گئے ہیں۔ کہ ان کے خلاف کچھ کہنا گویا اسلام کے اصل الاصول سے انحراف بن جاتا ہے۔ عوام تو عوام خواص بھی ایسی آواز کو کفر وارتداد تک جا پہنچاتے ہیں۔ بہت ہی کم ہیں جو علی الاعلان حق کو صحیح اور ناحق کو غلط کہنے کی جرأت وہمت رکھتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے مسلمان کو یہی تعلیم دی ہے کہ وہ جمہور کا خوف چھوڑ کر خدا خوفی ہی کو مدنظر رکھے۔ بات صاف اور کھری کرے، ذو معنی الفاظ سے اجتناب کرے۔ کیونکہ یہ نفاق اور مداہنت تک پہنچا دیتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد علی نے ہمیشہ اسی اصول کو مدنظر رکھا، تفسیر کرتے وقت صرف اور صرف قرآنی الفاظ کی پیروی کی، جمہور یا مسلکی نظریات کو کبھی حاوی ہونے نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی ''ترجمان القرآن'' مولانا محمد علی کی ''بیان القرآن'' سے زیادہ مختلف نہیں۔ لیکن مولانا محمد علی کے مقابل مولانا آزاد زیادہ بیباک اور نڈر نہیں۔ جو بات نجی تحریرات یا تقریبات میں کھل کر تسلیم کرتے ہیں، اسی بات کو ''ترجمان القرآن'' میں یا تو گول کر جاتے ہیں یا پھر ذو معنی الفاظ میں بیان کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

وفاتِ مسیح

مولانا آزاد مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے مولانا محمد علی سے بالمشافہ ملاقات کے دوران صاف اقرار کیا کہ مسیح ناصری عیسیٰ علیہ السلام وفات پا چکے ہیں۔ اس لئے دوبارہ دُنیا میں لوٹ کر نہ آئیں گے (دیکھو رسالہ ''دعوتِ عمل'' از قلم حضرت مولانا محمد علی۔ طبع ششم۔ ص ۲۵)۔ مولانا آزاد نے یہ بات بعض احمدی مبلغوں کو لکھ کر بھی دی تھی۔ مشہور احمدی مبلغ مولانا عمر الدین صاحب شملوی مرحوم (جو جماعت اہلحدیث سے آئے تھے) لکھتے ہیں، کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک خط ہمارے پاس موجود ہے جس میں وہ وفات مسیح کے معترف ہیں۔ (دیکھو پیغام صلح لاہور۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۸ء۔ ص ۸)۔ اس مقالہ کے شائع ہونے کے بعد بھی مولانا آزاد دس سال زندہ رہے، انہوں نے اسکی کبھی تردید نہ فرمائی۔

لیکن مولانا موصوف کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' پڑھنے والا کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا کیونکہ وہاں

انہوں نے اپنی ساحرانہ زباندانی کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے تاکہ جمہور میں ہیٹے نظر نہ آئیں:۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْآ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ.(ال عمران. آیت55)

اور (پھر) جب ایسا ہوا تھا کہ اللہ نے فرمایا تھا ''اے عیسیٰ! میں تیرا وقت پورا کروں گا، تجھے اپنی طرف اٹھالوں گا، تیرے منکروں (کی تہمتوں) سے تجھے پاک کردوں گا۔ اور جن لوگوں نے تیری پیروی کی ہے، انہیں قیامت تک تیرے منکروں پر برتری دوں گا۔

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَآ اَمَرْتَنِىْ بِهٖٓ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّىْ وَ رَبَّكُمْ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَّا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ ط وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ.(المائده. آیت117)

میں نے تو اُن سے صرف وہی بات کہی جس کے کہنے کا تو نے حکم دیا تھا۔ یعنی اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تمہارا، سب کا پروردگار وہی ہے۔ جب تک میں ان میں رہا، اُن کا نگران حال تھا۔ جب تو نے میرا وقت پورا کردیا، تو پھر تو ہی ان کا نگہبان تھا۔ اور تو ہر چیز کو دیکھنے والا اور اس کی نگہبانی کرنے والا ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ .....وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ٥ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ .(النساء آیت. 157تا158)

حالانکہ (واقعہ یہ ہے کہ) انہوں نے نہ قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھا کر ہلاک کیا۔ بلکہ حقیقت حال اُن پر مشتبہ ہوگئی (یعنی صورت حال ایسی ہوگئی کہ انہوں نے سمجھا، ہم نے مسیح کو مصلوب کردیا۔ حالانکہ نہیں کرسکتے تھے.....اور یقیناً یہودیوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا۔''

شُبِّهَ لَهُمْ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا آزاد لکھتے ہیں:۔

''آیت میں جس اشتباہ کا ذکر ہے اس کے یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ حضرت مسیح کی شخصیت

مشتبہ ہوگئی اوران کی جگہ کسی دوسرے آدمی کوسولی پر چڑھا دیا۔اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کی موت مشتبہ ہوگئی۔وہ زندہ تھے مگر انہیں مردہ سمجھ لیا۔''

(ترجمان القرآن،جلداول،ص431)

تینوں مقامات کا ترجمہ اور تشریح پڑھنے کے بعد بھی قاری یہ سمجھ نہیں پاتا کہ مولانا موصوف کا اپنا خود کا عقیدہ کیا ہے، یا قرآن مجید کی روشنی میں حیات مسیح کو مانا جائے یا وفات مسیح کو۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک دیرینہ کرم فرمانے یہی گلہ اپنے مکتوب میں کیا ہے:۔

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ..... جی مولانا آپ کے ہاتھ کی تحریر دیکھے ہوئے مدت ہوگئی۔ آنکھوں کو انتظار نے بیمار کردیا، براہ کرم ایک کتاب مدلل اور مفصل لکھ دیں جس کے بعد روز روز آپ کے سیکرٹری کو کسی تردید کی ضرورت پیش نہ آئے۔کیا معنی یہ مرزائی لوگ آپ کی طرف مختلف معاملات منسوب کرتے رہتے ہیں۔اور بعض حوالہ جات بھی دیتے ہیں۔مثلاً تذکرہ،''وکیل''، وغیرہ۔کبھی کہتے ہیں مولانا وفات مسیح کے قائل ہیں۔کبھی کہتے ہیں مولانا نے مرزا صاحب کی تعریف کردی ہے۔ براہ کرم ایسی فیصلہ کن کتاب لکھ دیں کہ پھر بولنے کی جرأت نہ رہے اوراس میں یہ بھی درج فرمادیں کہ اسکے ذریعہ تمام پرانی تحریریں منسوخ اور پرانے خیالات بھی تاکہ پرانی باتوں کے ذکر کی گنجائش نہ رہے۔(المکلف (ڈاکٹر) انعام اللہ خان سالار پنشنر 2101 کوچہ خوشی محمد بلوچستان)

جواب ازقلم مولانا آزاد : (۱)وفات مسیح کا ذکر خود قرآن میں ہے۔

(۲)مرزا صاحب کی تعریف یا برائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس لئے کہ

تو برُا ہے تو بھلا ہو نہیں سکتا اے ذوقؔ
وہ برُا خود ہے جو تجھ کو برا جانتا ہے

(ملفوظات آزاد۔مرتبہ محمد اجمل خان۔129 تا130۔مطبوعہ کراچی)

یہی عبارت ''مولانا آزاد ایک سیاسی ڈائری'' کے صفحہ۵۴۴ پر چھپی ہے۔جس کو دھولیہ (مہاراشٹر) کے اثرؔ بن یحییٰ انصاری نے۱۹۸۲ء میں مرتب کیا۔

مطلب ایک دم صاف ہے۔یعنی نہ تو وفاتِ مسیحؑ ہی کا انکار ہوسکتا ہے،اور نہ ہی حضرت مرزا صاحب کو برا کہا جاسکتا ہے۔واضح رہے کہ مولانا موصوف نے یہاں اپنی کسی بھی پرانی تحریر یا

رائے کو کالعدم قرار نہیں دیا۔مولانا کی یہ تحریر ان کے آخری ایام کی ہے۔

بعینہٖ یہی روش مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنائی ہے۔زبان سے وفات مسیح کا اقرار تو نہیں کرتے۔لیکن جملے ایسے استعمال کرتے ہیں جن سے وفات مسیح کا اظہار صاف نمایاں ہے۔انکی مشہور ومعروف تفسیر ''تدبرالقرآن'' کے یہ مقامات ملاحظہ فرمائیں:

''جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں۔اسی طرح محمد ﷺ بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں۔جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلہ سے گزرنا پڑا انہیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔''

(تدبرالقرآن۔جلد۳۔صفحہ۱۸۵۔زیرآیت۳:۱۴۴)۔

''جس طرح آیت ۱۵ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰؑ سے متعلق ان کی زندگی اور موت کے ہر مرحلہ میں سلام وتحیت کی بشارت دی ہے۔اسی طرح یہ حضرت مسیحؑ نے اپنی ولادت،موت اور بعثت کے ہر مرحلہ میں اپنے لئے قدوسیوں کے سلام اوران کی تحیت کی خبر دی ہے۔اس آیت سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ ولادت،موت اور موت کے بعد اُٹھائے جانے کے مراحل سے جس طرح ہر بشر گزرتا ہے اور گزرے گا اسی طرح سیدنا مسیحؑ بھی گزرے اور گزریں گے۔اس باب میں ان سے متعلق محض تفسیری روایات کی بنا پر کوئی ایسی بات فرض کر لینا احتیاط کے بالکل خلاف ہے۔جس کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے''۔

(تدبرالقرآن۔جلد۴۔ص۶۴۹۔سورہ مریم آیت۳۳ کا تشریحی نوٹ)

مولانا امین احسن اصلاحی کے شاگرد رشید پروفسر غامدی نے کھلے عام وفات مسیح کا اعلان کر دیا ہے۔یوٹیوب پر اسکا ویڈیو کلپ بھی دستیاب ہے۔

حضرت سلیمانؑ اور ہوا

قرآن شریف میں آتا ہے:۔

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا.

(الانبیاء:81)

مولانا محمد علی کا ترجمہ :''اور ہم نے سلیمانؑ کے لئے تیز چلنے والی ہوا کو(کام میں لگا دیا)۔وہ اس کے حکم سے اس زمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔''

ملتان (پاکستان) کے ادارہ تالیفات اشرفیہ نے حال ہی میں ''گلدستہ تفاسیر'' کے نام سے ایک ضخیم اردو تفسیر سات جلدوں میں شائع کی ہے۔اس تفسیر کو ''دور حاضر کی مستند تفاسیر کا جامع خلاصہ'' بتایا گیا ہے۔اس میں زیر بحث آیت کے تحت یہ عبارت ملتی ہے :

''تفسیر ابن کثیر میں تخت سلیمان علیہ السلام جو ہوا پر چلتا تھا اس کی کیفیت یہ بیان کی ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے لکڑی کا ایک بہت بڑا وسیع تخت بنوایا تھا،جس پر خود مع اعیان سلطنت اور مع لشکر اور آلات حرب کے سوار ہو جاتے ۔پھر ہوا کو حکم دیتے وہ اس عظیم الشان وسیع وعریض تخت کو اپنے کاندھوں پر اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا وہاں جا کر اُتار دیتی تھی۔یہ ہوائی تخت صبح سے دوپہر تک ایک مہینہ کی مسافت طے کرتا تھا۔اور دوپہر سے شام تک ایک مہینہ کی۔یعنی ایک دن میں دو مہینوں کی مسافت ہوا کے ذریعہ طے ہو جاتی تھی۔ابن ابی حاتم نے حضرت سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ اس تخت سلیمانی پر چھے لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں ۔جس میں سلیمان علیہ السلام کے ساتھ اہل ایمان انسان سوار ہوتے تھے۔اور ان کے پیچھے اہل ایمان جن بیٹھتے تھے۔پھر پرندوں کو حکم ہوتا کہ وہ پورے تخت پر سایہ کر لیں،تا کہ آفتاب کی تپش سے تکلیف نہ ہو۔پھر ہوا کو حکم دیا جاتا تھا وہ اس عظیم الشان مجمع کو اٹھا کر جہاں کا حکم ہوتا پہنچا دیتی تھی۔۔''

مفسرین کرام کے عجیب وغریب بیانات پر تبصرہ کرتے ہوئے حضرت مولانا محمد علی اپنی شاہکار تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں:۔

''قرآن کریم ان قصوں سے پاک ہے اور ہوا کا حضرت سلیمان کے لئے مسخر ہونا یہی ہے کہ آپ کے کام میں معاون تھی۔جس طرح ہوا سے مدد ملا کرتی ہے۔اور غالبًا تَجْرِیْ بِاَمْرِہٖٓ (وہ اس کے حکم سے چلتی تھی) میں اس ہوا کے کشتیاں چلانے کی طرف اشارہ ہے۔یا خود کشتیوں کا چلنا مراد ہے۔اور مطلب یہ ہے کہ ہوائے موافق یا بادبانوں وغیرہ کے استعمال سے جہاز دُور دُور کا سامان لیکر ملک شام میں جو

ارض مبارک ہے آتے تھے۔ چنانچہ یہودی انسکلو پیڈیا میں ہے کہ خلیج فارس اور خلیج عقبہ کے درمیان حضرت سلیمان کے جہاز چلتے تھے اور اس تجارت سے ملک میں سونا اور دولت بہت بڑھ گئی تھی۔ اور یہی وجہ حضرت سلیمان کی شان وشوکت کی تھی۔ قرآن شریف میں دوسری جگہ آتا ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ. (ابراھیم: 32) ترجمہ ''اور کشتیوں کو تمہارے کام میں لگایا تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلیں۔'' اور ہوسکتا ہے کہ یہاں بھی بِأَمْرِهِ (اس کے حکم سے) میں اشارہ امرالٰہی کی طرف ہی ہو۔ اور یہاں رِيحٍ (ہوا) کو عَاصِفَةً (تیز چلنے والی) کہا ہے۔ اور دوسری جگہ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً (ص: 36) ترجمہ: وہ اس (اللہ) کے حکم سے نرمی سے چلتی تھی۔ تو مطلب یہ ہے کہ وہ ریح عاصفہ ایسی نہ تھی کہ نقصان پہنچاتی ہو۔ باوجود تیز ہوا ہونے کے اس میں نرمی پائی جاتی تھی''۔

(بیان القرآن: ص910۔ فٹ نوٹ 2175)

اب مولانا آزاد کا ترجمہ اور تشریحی حاشیہ ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ: اور (دیکھو) ہم نے (سمندر کی) تُند ہواؤں کو بھی سلیمان کے لئے مسخر کردیا تھا کہ اُس کے حکم پر چلتی تھیں۔ اور اس سرزمین کے رُخ پر جس میں ہم نے بڑی ہی برکت رکھ دی ہے۔ یعنی فلسطین اور شام کے رُخ پر جہاں (بحر احمر اور بحر متوسط سے دُور دُور کے جہاز آتے تھے۔)

تشریح: آیت 81 میں فرمایا، ہم نے سمندر کی باد تند سلیمان کے لئے مسخر کردی تھی۔ یعنی بادبانی کے بڑے بڑے جہاز چلنے لگے تھے۔ اور خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہوائیں بھی ان کے لئے بار برداری اور نقل وحرکت کا ذریعہ ہوگئی تھی۔ قدیم عہدوں میں حضرت سلیمان پہلے شخص ہیں جنہوں نے جہازوں سے اسی طرح کام لینا شروع کیا کہ ہندوستان اور مغربی جزائر تک بحری آمد ورفت کا منظّم سلسلہ قائم ہوگیا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا تجارتی بیڑا وقت کا سب سے طاقتور بیڑا تھا۔''

(ترجمان القرآن۔ جلد۲۔ ص480 تا481)

دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی قدیم مفسروں کی رائے سے متفق ہیں اور اختلاف رائے کرنے والوں پر طنز وطعن کرتے ہیں۔ جبکہ مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر القرآن'' میں مولانا محمد علی کی تشریح سے متفق ہیں۔

سلیمانؑ کے شیاطین

وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ. وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ. (الانبیاء21. آیت82)

ترجمہ: مولانا محمد علیؒ۔ ''اور کئی سرکش جو اس کے لئے غوطہ زنی کرتے اور اس کے سوائے اور کام بھی کرتے تھے اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔''

ترجمہ مولانا فتح محمد جالندھری : اور دیوؤں (کی جماعت کو بھی ان کے تابع کر دیا تھا کہ ان) میں سے بعض ان کے لئے غوطے مارتے تھے اور اس کے سوا اور کام بھی کرتے تھے۔ اور ہم ان کے نگہبان تھے۔

تشریح از حضرت مولانا محمد علیؒ : شَيَاطِيْن۔ شیطان ہر سرکش کو کہتے جنّ ہو یا انسان..... قرآن کریم میں شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ (الانعام ۶ : ۱۱۲) بالتصریح مذکور ہیں۔ اور کئی جگہ پر خود مفسرین نے بالاتفاق شیاطین سے مراد صرف سردار یعنی انسان لئے ہیں۔ جیسے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ (البقرہ14:2) اور حالانکہ یہاں غوطہ زنی کا صاف ذکر ہے۔ جو کام ہمیشہ سے انسان کرتے چلے آئے ہیں۔ اور اب بھی کرتے ہیں۔ مفسرین کو یہ اصرار ہے کہ یہ سچ مچ کے شیطان ہی تھے، جو غوطہ زنی کرتے تھے۔ اور پھر كُنَّا لَهُمْ حَافِظِيْنَ (ہم ان کے نگہبان تھے) میں یہ قصہ بنایا گیا ہے کہ ان شیطانوں پر ایک گروہ ملائکہ کا اور مومن جنّوں کا حفاظت کے لئے مقرر تھا۔ اور پھر وہ شیطان سچ مچ معماروں کا کام بھی کرتے تھے: وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ (ص 38: آیت 37). ترجمہ: اور شیطانوں کو ہر ایک معمار اور غوطہ زن کو (ان کے کام میں لگایا)۔ گویا وہ زمانہ ایسا تھا کہ جتنے کام آج کل انسان کرتے ہیں اُس وقت وہ شیاطین کیا کرتے تھے۔ اور شیاطین اس وقت بدی کے محرک نہ تھے اور یہ قانون اللہ تعالیٰ

کا پیچھے بنا کہ اِنَّ الشَّیْطَانَ یَجْرِیْ مِنَ ابْنِ اٰدَمَ مَجْرِی الدَّمِ (حدیث)۔(یعنی شیطان انسان میں اس طرح پھرتا ہے جیسے خون پھرتا ہے۔) صاف اور سادہ الفاظ کو عجوبہ بنانے سے اور قرآن کریم کے سادہ بیانات میں عجیب وغریب قصے داخل کرنے سے قرآن کریم کی عظمت بڑھتی نہیں بلکہ اس سے اُسے نقصان پہنچتا ہے۔ اور کاریگروں کو شیاطین اس لئے کہا کہ وہ سرکش قوموں میں سے تھے۔ جنہیں سلیمانؑ نے فتح کر کے مغلوب کیا تھا اور بعض کو ان میں سے قید کر کے کام لیا جاتا تھا۔ جیسا کہ وَّاٰخَرِیْنَ مُقَرَّنِیْنَ فِی الْاَصْفَادِ (ص 38: آیت 38) (ترجمہ اور اوروں کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے۔) سے ظاہر ہے۔ اس لئے کُنَّا لَھُمْ حَافِظِیْنَ بھی فرمایا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی حفاظت نہ ہوتی تو ان سے کام لینا آسان نہ تھا''۔

(بیان القرآن۔ص 910 تا 911۔فٹ نوٹ 2176)

اب ہم مولانا ابوالکلام آزادؒ کی طرف آتے ہیں:۔

آیت کا ترجمہ: ''اور شیطانوں میں سے ایسے شیطان، جو اُس کے لئے غوطے لگاتے۔ اور اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے کام کرتے۔ اور ہم انہیں اپنی پاسبانی میں لئے ہوئے تھے۔''

تشریح: ''قرآن میں شیطان کا اطلاق شیاطین الجن پر بھی ہوا ہے۔ اور شیاطین الانس پر بھی۔ مثلاً اِنَّمَا ذٰلِکُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَ (ال عمران: آیت 174) میں شیطان سے مقصود قریش مکہ کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔ یا وَاِذْ زَیَّنَ لَھُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَھُمْ (الانفال 48:8) میں شیطان کا اطلاق سراقہ بن مالک ابن جعشم پر کیا گیا۔ جو قریش کو لڑائی پر اُبھارتا تھا، مگر پھر بھاگ گیا۔ پس یہاں آیت (82) میں بھی معلوم ہوتا ہے، شیاطین کا اطلاق شیاطین الانس ہی پر ہوا ہے۔ یعنی فلسطین اور شام کی اُن شریر اور سرکش قوموں پر جو حضرت سلیمان کے عہد میں بالکل مطیع ومنقاد ہوگئی تھیں۔ اور انہوں نے ہیکل کی تعمیر میں تیرہ برس تک ہر طرح کی سخت سخت خدمتیں انجام دی تھیں۔ ہیکل کی بنیاد حضرت داؤد نے ڈالی دی تھی۔ لیکن تعمیر حضرت سلیمان نے کی، تورات کی کتاب سلاطین اول سے معلوم ہوتا ہے کہ تیس ہزار آدمی تیرہ برس تک کام پر لگے رہے۔ تب

کہیں جا کر عمارت تیار ہوئی''۔(ترجمان القرآن۔جلد2۔ص482)

آیات قرآنی کے ترجمہ میں پوری احتیاط

ممبئی کی ڈاکٹر صالحہ صاحبہ نے حضرت مولانا محمد علی کی 'بیان القرآن' کا جو غیر جانب دارانہ تجزیہ پیش کیا ہے، اُس کو ہم پیچھے نقل کر چکے ہیں۔اُس تجزیئے میں انہوں نے کچھ ریمارک ایسے لکھے ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ہم انہیں یہاں پھر سے نقل کرنا چاہیں گے۔

(۱) ترجمہ سلیس ہوتے ہوئے ادبی متانت لئے ہوئے ہے۔

(۲) لسانی حیثیت سے فصاحت اور شستگی ہے۔

(۳) یہ ترجمہ وتفسیر ''غلط عقائد'' کی ترجمانی سے تقریباً خالی ہے۔

(۴) یہ ترجمہ پوری احتیاط اور خلوص سے کیا گیا ہے۔

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی نے بالکل یہی بات دو مختصر ترین جملوں میں بیان کی ہے۔ترجمہ کی بات آئی تو **''قابل قدر''** کہہ دیا اور تفسیر کے متعلق فرمایا : **''اسلام اور قرآن کی حقانیت کا نقش دِل پر ثبت کر دینے والی۔''** یہ دو خوبیاں جس بھی ترجمہ وتفسیر کو نصیب ہو جائیں تو اُس کے مفید، مستند اور معتبر ہونے میں کلام نہیں۔**فالحمد لله علی ذالک.**

تفسیر کی کچھ جھلکیاں ہم اوپر دکھا چکے ہیں، اب ترجمہ کی ندرت اور شان ملاحظہ فرمائیں:

(ا) سورۃ الفاتحہ کی آیت۔**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم.** کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے۔''ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔''

اس پر آریہ سماج والوں کا یہ اعتراض ہے کہ خدا تعالیٰ کی حمد کرنے والا، اس کی صفات رب، رحمان، رحیم اور مالک کا اقرار کرنے والا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُسی اکیلے کی عبادت کرنے والا، صرف اُسی اکیلے سے مدد طلب کرنے والا، اگر ایسا انسان بھی یہ کہے کہ ''مجھے سیدھا راستہ دکھا'' تو اوپر والا سارا قول واقرار اور عمل عبث ہو جاتا ہے۔قرآن کریم میں ہی دوسری جگہ آتا ہے۔ **وَاَنِ عْبُدُوْنِیْ هٰذَا صِرَاط مُّسْتَقِيْم** (یٰسین 36: آیت 61) اور کہ میری عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ

ہے۔سیدھا راستہ پالینے کے بعد بھی خدا سے یہ کہنا کہ ہمیں سیدھا رستہ دکھا، یقین کی کمی اور ایمان کی ناپختگی کی علامت ہے۔مولانا محمد علیؒ نے اس اعتراض کو ترجمہ ہی میں ختم کر دیا : ۔'تو ہم کو سیدھے رستے پر چلا''

اور تفسیری حاشیہ میں بتا دیا کہ ہدایت کے حقیقی معنی ''راستہ دکھانا، اُس پر چلانا اور منزل تک پہنچانا'' ہیں۔اب انگریزی کے لگ بھگ سبھی مترجمین نے ''اِھْدِنَا'' کے ترجمہ میں مولانا محمد علی ہی کا اتباع کیا ہے۔مابعد کے اردو تراجم میں بھی یہی نہج نظر آنے لگی ہے۔

(۲) سورۃ البقرہ آیت 6 میں آتا ہے۔ **اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْن.**

ترجمہ: ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں ان کے لئے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' (ترجمہ مولانا ڈاکٹر محمد محسن خان)

''جو لوگ کافر ہیں، اُنہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لئے برابر ہے، وہ ایمان نہیں لانے کے۔'' (مولانا فتح محمد جالندھری)

''جن لوگوں نے کفر کیا، ان کے لئے یکساں ہے۔ڈراؤ یا نہ ڈراؤ ، وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔'' (مولانا امین احسن اصلاحی)

''جو لوگ کافر ہو گئے ہیں ان کے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں (عذاب خدا سے) ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' (شیعہ ترجمہ۔مولانا سید صفدر حسین نجفی)

''بے شک جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے ان کے لئے برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے۔'' (مولانا طاہر القادری)

مطلب یہ کہ جو ایک بار کافر ہو گئے ان کے لئے تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔وہ ایمان نہیں لا سکتے۔حالانکہ یہ بات خلاف واقعہ ہے۔اس سے تو حضور نبی کریم صلی اللہ وعلیہ وسلم کا سارا ہی مشن نعوذ باللہ بیکار ہو جاتا ہے۔حضرت مولانا محمد علی نے لکھا ہے:

'' **سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَ اَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ.** (اُن کے لئے برابر ہے کہ تو ان کو

ڈرائے یا نہ ڈرائے) جملہ معترضہ ہے جو اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا. کی حالت کو بیان کرتا ہے۔ بحرالمحیط اور روح المعانی میں اس ترکیب کی صحت کو تسلیم کیا گیا ہے۔.....پس اصل معنی یوں ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کیا کہ ان پر تیرا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لاتے اور یہ سچ بھی ہے جو شخص ڈرانے کی پروا نہیں کرتا وہ کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہاں جب دل کی اس حالت کو تبدیل کر لیتا ہے تو پھر وہ بھی فائدہ اٹھا لیتا ہے۔ یہ حکم ایک خاص حالت پر ہے کسی خاص انسان پر نہیں۔'' (بیان القرآن۔ص۱۳۔ فٹ نوٹ۔۱۷)

اب آیت کے ترجمہ کو ملاحظہ فرمائیں:۔

''جنہوں نے انکار کیا (یہاں تک) کہ ان کے لئے برابر ہے کہ تو ان کو ڈرائے یا نہ ڈرائے وہ نہیں مانتے۔'' (محمد علی)

بعینہٖ یہی بات مولانا ابوالکلام آزاد کے ترجمہ میں کہی گئی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

''(لیکن) وہ لوگ جنہوں نے (ایمان کی جگہ) انکار کی راہ اختیار کی (اور سچائی کے سننے اور قبول کرنے کی استعداد کھودی) تو (ان کیلئے ہدایت کی تمام صدائیں بیکار ہیں) تم انہیں (انکار حق کے نتائج سے) خبردار کرو یا نہ کرو، وہ ماننے والے نہیں۔ (ترجمان القرآن۔جلد 1۔ص257)

اب ذرا دونوں ترجموں پر نگاہ ڈالئے۔ مولانا محمد علیؒ کا ترجمہ کتنا مختصر، صحیح، رواں اور تحت اللفظ ہے۔ اس کے مقابل مولانا آزاد مرحوم نے کس قدر ایزادی جملوں کو بروکار لایا ہے۔ بہرحال ترجمے میں ''انکار'' لفظ کے برمحل انتخاب واستعمال نے سونے پر سہاگہ کا کام کر دیا ہے۔ اس سے ترجمے کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔

(۳) سورہ ھود (آیت 34) میں آیا ہے:

وَلَا یَنْفَعُکُمْ نُصْحِیْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَکُمْ اِنْ کَانَ اللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ.

ترجمہ: ''اور تمہیں میری نصیحت نفع نہیں دے گی اگر میں چاہوں کہ تمہیں نصیحت کروں جبکہ اللہ تعالیٰ تمہیں گمراہ کرنا چاہتا ہو۔'' (ترجمہ ڈاکٹر محسن خان)

''اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور خدا یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے

تو میری خیر خواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی۔'' (ترجمہ مولانا فتح محمد)

گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے۔ اللہ کا نہیں۔ ہاں پارسی مذہب میں اہرمن کا بنیادی وصف بدی کو تحریک دینا ہی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح اور واضح تعلیم یہی ہے کہ اللہ کی پاک ذات کی طرف کسی برے وصف کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے یہاں ''غَوٰی'' کو گمراہی کے معنی میں نہیں لیا جا سکتا۔ مولانا محمد علی ''بیان القرآن'' میں لکھتے ہیں:۔

امام راغب کہتے ہیں۔ اَلْغَیُّ جَھْلٌ مِنْ اِعْتِقَادٍ فَاسِدٍ. یعنی غَیٌّ وہ جہالت ہے۔ جو اعتقاد فاسد سے پیدا ہو۔ اسی لئے عَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی (طٰہٰ 20: آیت 121۔ آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس ناکام ہوا) میں غَوَّی کے معنی جَھِلَ کئے گئے ہیں۔ اور غَوٰی کے معنی خَابَ یعنی ''ناکام رہا'' بھی کئے گئے ہیں۔ اور فَسَدَ عَیْشُہٗ بھی یعنی ''اس کی زندگی خراب ہوگئی''۔ اِنْ کَانَ اللّٰہُ یُرِیْدُ اَنْ یُّغْوِیَکُمْ (ھود. 34) میں یُغْوِیَ کے معنی دو طرح پر کئے گئے ہیں۔ یُعَاقِبَکُمْ عَلٰی غَیِّکُمْ یعنی تمہاری غی کی تمہیں سزا دے یا یَحْکُمُ عَلَیْکُمْ بِغَیِّکُمْ یعنی تمہاری غَیّ کا تم پر حکم لگائے (مفرداتِ راغب و تاج العروس)۔ پس اِغْوَآءٌ (بدی کی تحریک کرنا، دوسرے کو بدراہ پر لگانا) والے معنی اللہ کے لئے قطعاً جائز نہیں۔ سارے قرآن کریم میں کسی جگہ بھی یہ ذکر نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے (شیطان کو 2:16 میں) نافرمانی کا حکم دیا تھا۔ بلکہ حکم تو فرمانبرداری کا ہی دیا تھا۔'' (بیان القرآن۔ جلد 1۔ ص 505۔ فٹ نوٹ 1058)

زیر بحث آیت کریمہ کا ترجمہ:

''اور تمہیں میری نصیحت نفع نہیں دے سکتی اگر میں چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں، اگر اللہ کا ارادہ ہو چکا ہو کہ وہ تمہیں ہلاک کرے۔'' (محمد علی)

تشریح: ''یُغْوِیَکُمْ (بحث اوپر نقل ہو چکی ہے۔ خورشید) ایک انسان کی خیر خواہی دوسرے کے کام نہیں آ سکتی جب وہ خود غلط راہ پر قدم مارتا ہوا اتنی دور نکل جائے کہ اللہ تعالیٰ اس پر گمراہ ہونے کا یا ہلاکت کا حکم لگا دے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسا حکم اسی وقت لگاتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ ایک شخص اپنی اصلاح کسی صورت میں نہیں کرتا۔'' (بیان القرآن: ص 651۔ فٹ نوٹ: 1460)

اب مولانا آزاد کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

''اور اگر اللہ کی مشیت یہی ہے کہ تمہیں ''ہلاک'' کرے تو میں کتنا ہی نصیحت کرنا چاہوں، میری نصیحت کچھ سودمند نہ ہوگی۔'' (ترجمان القرآن۔جلد 2۔ص190)

تعجب ہے کہ علامہ رحمت اللہ طارق نے اپنی ''برہان القرآن'' میں مولانا آزاد کے اس ترجمہ کی نسبت یہ کیسے لکھ دیا۔

''یہاں اِغْـــوَآء کے معنی جب ہلاک ٹھہرے تو کچھ بعید نہیں کہ امام ابوالکلام آزاد (1958م) کو اس معنی کا پتہ چل گیا ہو یا بصیرتِ قرآنی آپ کو اس طرف لے گئی ہو۔'' (برہان القرآن۔ص501)

جبکہ یہی بات پچیس سال پہلے مولانا محمد علی ''بیان القرآن'' میں کہہ چکے تھے۔

(۴) قرآن پاک میں آتا ہے:۔

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْن.(ال عمران. 45:3)

ترجمہ: ''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی خوشخبری دیتا ہے۔اُس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔وہ دُنیا اور آخرت میں بڑے مرتبے والا اور اللہ کے قریبی بندوں میں سے ہوگا۔'' (ڈاکٹر محسن خان)

علامہ رحمت اللہ طارق لکھتے ہیں:۔

''کلمہ کے یہ معنی کہ اللہ سبحانہ مریم کو ایک کلمہ کی بشارت دیتے ہیں۔گویا مسیح اللہ تعالیٰ کا ایک کلمہ ہیں۔یعنی اللہ کا جز کیونکہ کلمہ متکلم کا جزو ہوتا ہے۔اس سے مسیحی عقیدے کی تائید ہوجاتی ہے۔'' (طارق)

''تو یہ نظر کا پھیر ہے اور قرآن کسی کے ''نظر کے پھیر'' کی ذمہ داری قبول نہیں کرسکتا، کہ وہ ''عربی مبین'' ہے۔اس نے ''کلمہ'' کا لفظ استعمال کرکے ''مفسروں'' اور ''مسیحیوں'' کی سوچ کا سدباب کردیا ہے۔کیونکہ ''کلمہ'' کا لفظ مؤنث ہے اور مسیح علیہ السلام ''مذکر'' تھے۔یہی وجہ ہے کہ بالغ نظر مترجموں اور لسانیاتِ عرب کے

جو ہر یوں نے مسیح کو ''کلمۃ اللہ'' تسلیم نہیں کیا۔'' (برہان القرآن۔ص263)

مولانا محمد علی نے زیرِ نظر آیت کریمہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:۔

''فرشتوں نے کہا : اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلام کے ساتھ خوشخبری دیتا ہے۔اس (مبشر) کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہے۔ جو دُنیا اور آخرت میں وجاہت والا اور مقربوں میں سے ہوگا۔''

مولانا آزاد کا ترجمہ یہ ہے:۔

''اور (پھر) جب ایسا ہوا کہ فرشتوں نے کہا :''اے مریم'' اللہ تجھے اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا اور مریم کا بیٹا کہلائے گا۔دنیا و آخرت، دونوں میں ارجمند ہوگا۔'' (ترجمان القرآن، جلد 1۔ص351)

بقول علامہ طارق یہ قرآن پاک کی ایسی غیر معمولی اور صحیح ترجمانی ہے، جو عربی نژاد مصنّفین کو بھی میسر نہیں۔

1995ء میں ایک نامور پاکستانی عالم جناب صفدر حسین صدیقی کی ایک تصنیف بنام ''قرآن اور انسان'' منظر عام پر آئی، جس کو پاکستان کے مشہور پبلشر فیروز سنز لاہور نے شائع کیا ۔مصنف نے کتاب میں نہایت قابلیت سے قرآن کریم کی آیات کے ذریعہ زندگی کے مختلف مسائل اور نظریات پر روشنی ڈالی ہے۔کتاب میں آیاتِ قرآنی کا اُردو ترجمہ مولانا محمد علیؒ کی بیان القرآن سے لیا گیا ہے۔اور دیباچہ میں ایسا کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا ہے :

''آیات کا ترجمہ زیادہ تر مولانا محمد علی مرحوم کے ترجمہ قرآن سے حاصل کیا گیا ہے۔ کیوں کہ وہ قرآن مجید کا بڑی حد تک لفظی ترجمہ ہے۔ترجمانی نہیں۔اور اس وجہ سے یہ مشیت ایزدی کو اُردو زبان میں زیادہ بہتر طور پر بیان کرتا ہے۔''

(قرآن اور انسان۔ص۲۹۔از صفدر حسین صدیقی۔ناشر فیروز سنز لاہور)

مفسر قرآن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

جو بھی قاری مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ''تفہیم القرآن'' کو مولانا محمد علی لاہوری کی

''بیان القرآن'' کے ساتھ ملا کر پڑھے گا، وہ خود جان جائے گا کہ مولانا مودودی نے کس حد تک مولانا محمد علی کی اتباع کی ہے۔ جہاں بھی انہوں نے مولانا محمد علی کی رائے یا تشریح سے اختلاف ظاہر کیا ہے۔ وہیں انکی تفسیر اپنے اعلیٰ مقام سے ہٹ کر دقیانوسیت کی ادنیٰ سطح پر آ گئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض احباب کو ہمارا یہ ریمارک ناگوار اور کڑوا لگے۔ ہم اپنے بیان کی تائید میں مندرجہ ذیل شواہد اور ثبوت پیش کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

(ا)۔ مولانا محمد علی لاہوری نے اپنی شہرہ آفاق انگریزی تفسیر کی طرح اپنی مایہ ناز اردو تفسیر ''بیان القرآن'' میں بھی ہر سورت کے آگے اُس سورت کا ایک سلجھا ہوا تعارفی انٹروڈکشن (Introduction) دیا ہے۔ جس کا خاکہ اس طرح ہے:

ا۔ سورت کا نام۔ اس میں وجہ تسمیہ اور نام میں موجود خصوصیت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۲۔ خلاصہ مضمون۔ اس میں پوری سورت کے مضامین کا نچوڑ اور اُن میں پائی جانے والی تعلیم اور خصوصی نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ رکوعوں کا باہمی ربط اور تال میل۔

۳۔ زیر بحث سورت کا پچھلی اور اگلی سورت سے تعلق۔ اور مصحف قرآنی میں موجودہ مقام پانے کی وجہ اور اس میں پنہاں فلاسفی۔

۴۔ زمانہ نزول۔ اس میں تاریخی شواہد اور شان نزول وغیرہ کا بیان آجاتا ہے۔

بالکل یہی نہج اور طریقہ مولانا مودودی صاحب نے ''تفہیم القرآن'' میں اختیار کیا ہے۔ اُن کے تمہیدی نوٹ کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

ا۔ نام اور وجہ تسمیہ

۲۔ زمانہ نزول

۳۔ شان نزول

اب ہم اصل ترجمہ اور تفسیر کی طرف آتے ہیں :

حروف مقطعات۔ تمام متداول تراجم میں ان حروف کو اسرار الٰہی کہا گیا ہے۔ جن کے معنی سوائے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس ضمن میں مولانا محمد علی لاہوری کا تفسیری نوٹ یوں ہے:

''یہ حروف جو بعض سورتوں کی ابتداء میں آتے ہیں مقطعات کہلاتے ہیں۔۔۔عام طور پر ترجموں میں ان کے معنی نہیں کئے جاتے۔ حالانکہ صحابہؓ سے ثابت ہے کہ یہ حروف الفاظ کے قائم مقام ہیں۔اور حروف سے الفاظ کی طرف اشارہ کرنا تمام زبانوں میں مروج ہے۔آج کل انگریزی میں تو یہ رواج بہت ہی بڑھا ہوا ہے۔عرب میں بھی یہ دستور تھا۔ چنانچہ اس مصرعہ میں **قُلتُ لَهَا قِفِي قَالَتْ قَاف** ۔ ق کے معنی **قَدْوَقَفْتُ** ہیں یعنی میں ٹھہر گئی۔اور بھی کئی مثالیں اس کی ہیں۔مگر عربی میں کوئی مقررہ قاعدہ نہ تھا کہ فلاں حرف سے فلاں لفظ کی طرف اشارہ ہوگا۔ بلکہ سیاق وسباق سے معلوم کیا جاتا تھا۔اس لئے قرآن کریم میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ایک جگہ جو معنی ایک حرف کے لئے گئے ہیں دوسری جگہ بھی وہی ہوں۔ہاں جو مجموعہ ایک ہی طرح پر آیا ہے اس کا مفہوم ایک ہی ہے۔جیسے **الٓمّٓ** کہ اس سورت کے علاوہ پانچ اور سورتوں کی ابتدا میں ہے۔۔۔۔**الٓمٓ** کے معنی حضرت ابن عباسؓ سے **اَنَااللّٰهُ اَعْلم** مروی ہیں یعنی میں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔''

(بیان القرآن۔جلد ا۔فٹ نوٹ ۸)

اب مولانا مودودی صاحب کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں:

''یہ حروفِ مقطّعات قرآن مجید کی بعض سورتوں کے آغاز میں پائے جاتے ہیں۔جس زمانے میں قرآن مجید نازل ہوا ہے اُس دور کے اسالیبِ بیان میں اس طرح کے حروفِ مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔خطیب اور شعراء دونوں اس اسلوب سے کام لیتے تھے۔چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اسکی مثالیں ہمیں ملتی ہیں۔اس استعمالِ عام کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو۔ بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ ان سے مراد کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کے خلاف نبی ﷺ کے ہم عصر مخالفین میں سے کسی نے بھی یہ اعتراض کبھی نہیں کیا کہ یہ بے معنی حروف کیسے ہیں۔جو تم بعض سورتوں کی ابتدا میں بولتے ہو۔یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام سے بھی

ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ انہوں نے نبی ﷺ سے ان کے معنی پوچھے ہوں۔ بعد میں یہ اسلوب عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا اور اس بنا پر مفسرین کے لئے ان کے معنی متعیّن کرنا مشکل ہو گیا۔۔۔ایک عام ناظر کے لئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو۔''

(تفہیم القرآن۔جلد ا۔ص ۴۹۔فٹ نوٹ ا)

اس طرح مولانا مودودی نے قدامت پسند علماء اور جدید روشن خیال قاریوں، دونوں ہی کو مطمعن کرنے کی کوشش کی ہے۔لیکن مولانا کے اس بیان سے قاری کے دل میں یہ حسرت ضرور پیدا ہوتی ہے کہ آج کے مسلمانوں سے اُس دَور کے کافر لوگ زیادہ خوش قسمت تھے جنہیں کم سے کم حروف مقطعات کے معنی تو سمجھ میں آتے تھے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۲ میں آتا ہے :

وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

جس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے :

''اور برسایا آسمان سے پانی پھر پردہ عدم سے نکالا بذریعہ اس پانی کے پھلوں سے غذا کو تم لوگوں کے واسطے۔'' (ترجمہ مولانا تھانوی)

''اور آسمان سے پانی اُتارا، تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو۔'' (ترجمہ۔مولانا احمد رضا خان)

''اور اتارا آسمان سے پانی اور اس سے پیدا کئے پھل تمہاری روزی کے لئے۔'' (ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی)

حضرت مولانا محمد علی لاہوری کا ترجمہ یہ ہے :

''اور اوپر سے پانی اُتارا، پھر اس کے ساتھ تمہارے لئے پھلوں سے رزق نکالا۔''

اب مولانا مودودی کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں :

''اور اوپر سے پانی برسایا اور اس کے ذریعے سے ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لئے رزق بہم پہنچایا۔''

سورۃ البقرہ کی آیت ۱۹ اور ۲۰ کے تحت جو تشریحی حاشیہ مولانا محمد علی نے لکھا ہے وہ یہ ہے:

''بہرا۔۔گونگا۔۔۔اندھا۔مجازی معنی مراد ہیں۔ یعنی کلمہ حق سنتے نہیں نہ کہتے ہیں۔نشانات صداقت دیکھتے نہیں۔یہ شدید نفاق والے ہیں جو حق کی شنوائی اور بینائی سے ہی محروم ہو چکے ہیں۔یا منافقوں کے سردار ہیں اور دوسری مثال والے ان کے پیرو ہیں۔یا وہ جن کا نفاق محض بزدلی اور کمزوری کی وجہ سے ہے۔''

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :

''اس تمثیل میں صیّب یا رحمت کی بارش سے مراد وحی الٰہی ہے۔اندھیرے سے مراد مشکلات ہیں جو وحی الٰہی کے قبول کرنے میں پیش آتی ہیں۔کڑک سے مراد بعض خوفناک امور ہیں جیسے مثلاً دشمنوں کے حملے۔جن سے کمزور دل خائف ہو جاتے ہیں۔چمک سے مراد وہ کامیابیاں ہیں جو مطلع کو روشن کر دیتی ہیں۔یہ دوسری قسم کے منافق ہیں۔جو بالکل اپنی روشنی نہیں کھو چکے،مگر ان کے اندر کچھ کمزوری ہے۔کوئی مشکلات سامنے آجاتی ہیں تو فوراً گھبرا جاتے ہیں۔دشمن کی طرف سے تیاری دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ بس اب مارے گئے۔۔۔''

(بیان القرآن۔جلد اول۔فٹ نوٹ۔ ۳۰(اور ۳۱)

اب ''تفہیم القرآن'' کا نوٹ ملاحظہ فرمائیں :

''پہلی مثال اُن منافقین کی تھی جو دل میں قطعی منکر تھے۔اور کسی غرض و مصلحت سے مسلمان بن گئے تھے۔اور یہ دوسری مثال اُنکی ہے جو شک اور تذبذب اور ضعفِ ایمان میں مبتلا تھے۔کچھ حق کے قائل بھی تھے۔مگر ایسی حق پرستی کے قائل نہ تھے کی اس کی خاطر تکلیفوں اور مصیبتوں کو بھی برداشت کر جائیں۔اس مثال میں بارش سے مراد اسلام ہے۔۔۔۔مثال کے آخری حصہ میں ان منافقین کی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور جب مشکلات کے دَل بادَل چھانے لگتے ہیں یا ایسے احکام دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشات نفس اور ان کے تعصّباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹھک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

(تفہیم القرآن جلد اول۔ص ۵۶)

یہ بالکل وہی بیان ہے جو 'بیان القرآن' میں آیا ہے۔بس پیرایہ اور الفاظ بدل گئے ہیں۔

فرشتوں کا وجود۔ حضرت مولانا محمد علی لکھتے ہیں :

''۔۔۔مَلَک بمعنی رسول ہے۔۔۔۔ملائکہ نورانی ہستیاں ہیں جن کو یہ آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔اور وہ اللہ کی طرف سے رسول یعنی وسائط ہیں۔مسلمانوں میں سے بعض لوگ اس طرف گئے ہیں کہ ملائکہ صرف قوتوں وطاقتوں کا نام ہیں۔حتٰی کہ نبوت کو بھی ایک ملکہ یا طاقت قرار دیکر اس کا نام جبرائیل قرار دیا ہے۔اس عقیدہ کی رو سے بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ وحی الٰہی انسان کے اندر سے ہی ایک آواز کے پیدا ہونے کا نام ہے۔اور وہ کوئی خارجی شے نہیں۔حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کے انسان سے کلام کرنے کا ذکر ہے وہاں اگر کلام کی ایک صورت یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ دل میں ایک بات ڈال دیتا ہے۔تو دوسری صورت من ورآی الحجاب فرمائی اور تیسری یہ کہ وہ رسول بھیج کر اپنا کلام پہنچاتا ہے۔جہاں رسول سے مراد جبرائیل ہی ہے۔پس اگر یہ محض اندر کی شے ہوتی تو یہ تیسری صورت قطعاً ناممکن تھی۔۔۔۔علاوہ ازیں دنیا کے بڑے بڑے راستبازوں کی شہادت اس بات پر ہے کہ ملائکہ علیحدہ ہستیاں ہیں۔۔۔ملائکہ کا علیحدہ ہستیاں ہونا ہی صحیح خیال ہے۔۔۔''

(بیان القرآن۔جلد اول۔فٹ نوٹ ۴۵)

''تفہیم القرآن'' کا نوٹ یوں ہے:

''مَلَک کے اصل معنی عربی میں ''پیامبر'' کے ہیں۔اسی کا لفظی ترجمہ فرستادہ یا فرشتہ ہے۔یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں، جو تشخص نہ رکھتی ہوں۔بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کی تدبیر وانتظام میں کام لیتا ہے۔۔۔۔''

(تفہیم القرآن۔جلد اول۔ص ۶۲۔فٹ نوٹ ۳۷)

رفعنا فوقکم الطور

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ

(۲:۶۳)

''یاد کرو وہ وقت جب ہم نے طور کو تم پر اٹھا کر تم سے پختہ عہد لیا تھا۔ کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی کے ساتھ تھامنا۔۔'' (تفہیم ۲:۶۳)

''اور جب ہم نے تم سے قول وقرار لیا (کہ توراۃ پر عمل کریں گے) اور ہم نے طور پہاڑ کو اٹھا کر تمہارے اوپر (محاذات میں) معلق کر دیا کہ (جلدی) قبول کرو جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے مضبوطی کے ساتھ۔۔۔'' (ترجمہ تھانوی)

''اور جب ہم نے تم سے اقرار لیا اور تمہارے اوپر پہاڑ بلند کیا، جو ہم نے تمہیں دیا ہے اسے زور سے پکڑ رکھو۔۔۔'' (ترجمہ۔محمد علی)

لفظ پرست علماء یہی کہتے ہیں کہ سچ مچ پہاڑ کو اٹھا کر بنی اسرائیل کے اوپر معلق کر دیا گیا، اور کہا گیا کہ حق کا اقرار کرو۔ اللہ کے دین میں اس زبردستی کے عہد و اقرار کی اہمیت اور وقعت کیا ہو سکتی ہے؟ مولانا محمد علی لکھتے ہیں:

''**رفعنافوقکم الطور** کے معنی یہ نہیں کہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے اُٹھا کر اونچا کیا۔ بلکہ یہ کہ تم نیچے تھے اور پہاڑ اوپر اُٹھا ہوا تھا۔۔۔''

''اس آیت کے یہ معنی کرنا کہ بنی اسرائیل کے سروں پر پہاڑ لا کر معلق کر دیا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام کا نہ مانو گے تو ابھی پہاڑ تمہارے سروں پر آ پڑے گا۔ قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہے **لا اکراہ فی الدین**۔ جب انسان کو حکم ہے کی دین میں جبر نہ کرے تو خود خدا کا جبر کرنا کیا معنی۔ علاوہ ازیں اس جبر کا تو یہی جواب بنی اسرائیل کی طرف سے کافی ہے کہ ہم نے اقرار کوئی نہیں کیا۔ ڈرا کر اقرار لیا گیا۔ ایسا اقرار تو کسی عدالت میں بھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔ بلکہ صرف ان کو یاد دلایا ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ پر احکام نازل ہوئے تو اس وقت بنی اسرئیل کے بزرگ پہاڑ کے نیچے موجود تھے۔۔۔ تورات میں یہ الفاظ ہیں :''اور موسیٰ لوگوں کو خیمہ گاہ سے باہر لایا کہ خدا سے ملا دے۔ اور وے پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے'' (خروج ۱۹:۱۷)۔ اور ان کو حکم تھا کہ نیچے ہی رہیں اور حضرت موسیٰ کے ساتھ اوپر نہ آئیں (خروج ۱۹:۲۴)۔''

(بیان القرآن۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۷)

مولانا مودودی لکھتے ہیں :

''بس مجملاً یوں سمجھنا چاہئے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورت حال پیدا کردی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آن پڑے گا۔۔۔'' (تفہیم القرآن۔جلد اول۔صفحہ ۸۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور تین جھوٹ۔اس موضوع پر ہم پیچھے بحث کر آئے ہیں۔اس معاملے میں مولانا مودودی نے بھی مولانا محمد علی ہی کا موقف اختیار کیا ہے اور بخاری شریف کی متعلقہ حدیث کو غلط ٹھہرایا ہے۔مولانا مودودی کا حاشیہ خاصا طویل اور عالمانہ ہے۔فقط چند جملے بطور نمونہ پیش خدمت ہیں:

''بدقسمتی سے حدیث کی ایک روایت میں یہ بات آگئی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنی زندگی میں تین جھوٹ بولے ہیں۔۔۔یہ حدیث۔۔۔صرف اسی وجہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے کہ یہ ایک نبی کو جھوٹا قرار دے رہی ہے۔بلکہ اس بنا پر بھی غلط ہے کہ اس میں جن واقعات کا ذکر کیا گیا ہے وہ تینوں ہی محل نظر ہیں۔۔۔کیا یہ کوئی معقول بات ہے کہ جس حدیث کا متن ایسی باتوں پر مشتمل ہو اس کو بھی ہم نبی ﷺ کی طرف منسوب کرنے پر صرف اسلئے اصرار کریں کہ اس کی سند مجروح نہیں ہے؟۔۔۔''

(تفہیم القرآن۔جلد ۳۔صفحہ ۱۶۷ تا ۱۶۸)

ذوالقرنین کون تھا۔ اس پر بھی ہم پیچھے بحث کر چکے ہیں۔اس ضمن میں مولانا مودودی کا بیان یہ ہے :

''یہ مسئلہ قدیم زمانے سے اب تک مختلف فیہ رہا ہے۔۔۔قدیم زمانے میں بالعموم مفسرین کا میلان سکندر کی طرف تھا۔لیکن قرآن میں اسکی جو صفات وخصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ مشکل ہی سے سکندر پر چسپاں ہوتی ہیں۔جدید زمانے میں تاریخی معلومات کے بنا پر مفسرین کا میلان زیادہ تر ایران کے فرمان روا خورس (خسرو یا سائرس) کی طرف ہے۔اور یہ نسبتاً زیادہ قرین قیاس ہے۔'' (تفہیم القرآن۔جلد ۳۔صفحہ ۴۲ و ۴۳)

یہ بات سب سے پہلے حضرت مولانا محمد علی لاہوری نے کہی،مولانا ابوالکلام آزاد نے مزید

تاریخی تحقیقات کے ساتھ اسے آگے چلایا۔اب یہ نظریہ قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

یاجوج اور ماجوج کون ہیں؟ حضرت مولانا محمد علی لاہوری لکھتے ہیں:

''۔۔۔بعض کے نزدیک وہ یافث بن نوح کی اولاد سے دو قبیلے ہیں اور تُرک بھی انہیں میں سے ہیں، جو دیوار سے ادھر چھوڑا جانے کی وجہ سے ترک کہلائے اور کعب احبار سے روایت ہے کہ یاجوج ماجوج آدم کی اولاد میں سے ہیں مگر حوّا سے نہیں (روح المعانی)۔پس یاجوج ماجوج نسل انسانی میں سے ہیں۔اوران کے متعلق جو بعض الفاظ احادیث میں آتے ہیں، جن سے بعض کو یہ خیال گزرتا ہے کہ وہ ہماری طرح کے آدمی نہیں،تو لازماً وہ استعارہ کے رنگ کے ہیں۔اوراس بارہ میں سب روایات قابل قبول بھی نہیں۔مثلاً یہ قول جو حضرت ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہے کہ ان کے قد ایک بالشت اور دو بالشت یا زیادہ سے زیادہ تین بالشت ہیں ۔ یا یہ کہ ان میں سے ایک مرتا ہے تو ایک ہزار ذریت چھوڑتا ہے۔ ۔۔یہودی انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ جوزیفس ان کو وہی قوم بتاتا ہے جو سی تھیئن کہلاتی ہیں اور جیروی کہتا ہے کہ میگاگ (ماجوج) کوہ قاف سے پرے بحیرہ خضر کے قریب تھا۔انسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا بھی اسی رائے کا موئد ہے یعنی انہیں سیتھیئن قومیں قرار دیتا ہے۔اور کہتا ہے کہ شمال کی بہت سی اقوام میں سے کسی ایک یا سب پر اس لفظ کا استعمال ہوسکتا ہے۔بائبل میں ہے :

''خداوند کا کلام مجھ کو پہنچا اوراس نے کہا کہ اے آدمزاد تو جوج کے مقابل جو ماجوج کی سرزمین کا ہے اور روش اور مسک اور توبال کا سردار ہے اپنا منہ کر اور اس کے برخلاف نبوت کر اور کہہ کہ خداوند یہوداہ یوں کہتا ہے کہ دیکھ اے جوج روش اور مسک اور توبال کے سردار میں تیرا مخالف ہوں اور میں تجھے پھرا دونگا اور تیرے جبڑوں میں بنسیاں ماروں گا'' (حزقی ایل۔ ۳۸:۱تا۴)۔یہاں تین نام یاجوج ماجوج کے ذکر میں آئے ہیں : روش،مسک اور توبال۔ مفسرین بائبل ایسے صریح الفاظ سے گھبرا کران ناموں کو ایشائے کوچک میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔اور کہتے ہیں روش سے مراد روس نہیں۔کیوں اس لئے کہ اس صورت میں پیشگوئی اپنے ہی گھر کے خلاف ثابت ہوتی ہے۔مگر واقعات ایسے زبردست ہیں کہ انکے سامنے یہ انکار قائم نہیں رہ سکتا۔یاجوج ماجوج کا کوہ قاف کے شمال میں ہونا ایک امر مسلم ہے۔ جس کو یہودی انسائیکلو پیڈیا اورانسائیکلو پیڈیا بری ٹینیکا دونوں میں صحیح تسلیم کیا گیا ہے۔اب ایشیائے کوچک میں ان ناموں کو تلاش کرنا عبث کوشش ہے۔کوہ قاف کے

شمال میں روس بھی ہے اور مسک اور توبال بھی موجود ہیں۔ موخرالذکر دونوں ناموں کے دو دریا (مسکو اور توبال) کوہ قاف کے شمال میں ملک روس میں بہہ رہے ہیں اور ان میں اول پر ماسکو کا قدیم شہر آباد ہے۔ اور موخرالذکر پر توبالسک۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ جوج یا یاجوج جس کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد روس ہی ہے۔ نہ کچھ اور۔ پس یاجوج ماجوج میں سے ایک روس ہے یا سلانی قوموں کا مسکن۔ آیا ماجوج ٹیوٹن قوموں کا مسکن ہے یا نہیں۔ گو اس کی تائید میں کوئی دلائل پیش نہیں کرسکتا۔ مگر اقوام یورپ کے ایک حصہ پر اس صراحت سے یاجوج کا نام صادق آنا، جو خود بائبل اور انسائیکلوپیڈیا سے ثابت ہے، کوئی شک باقی نہیں رہنے دیتا کہ ماجوج سے مراد بھی انہی قوموں کا کوئی دوسرا بڑا عظیم الشان حصہ ہے۔ اور لندن کے گلڈ ہال کے سامنے یاجوج اور ماجوج کے بتوں کا نصب ہونا، جن کی اصلیت بھی بہت پرانے زمانے کی بتائی جاتی ہے۔ یعنی اس قسم کے بت ہنری خامس کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ بتاتا ہے کہ جس نتیجہ پر ہم پہنچے ہیں وہی درست ہے اور ممکن ہے کہ ابتدا میں ان قوموں کے باہم تعلقات بھی ہوں یا یہ ایک ہی قوم کی دو شاخیں ہوں۔''

(بیان القرآن۔ جلد۲۔ فٹ نوٹ ۱۹۶۰)

اور ذوالقرنین کی دیوار سے متعلق اپنی تحقیق و تدقیق کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں :

''یہ بیان کچھ شبہ باقی نہیں رہنے دیتا کہ جس دیوار کا ذکر قرآن شریف میں ہے یہی دربند کی دیوار ہے جو قاف کی شمالی قوموں کو ایران پر حملہ آور ہونے سے روکنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ جنہیں نہ صرف قرآن شریف یاجوج ماجوج قرار دیتا ہے بلکہ خود مورخین بھی انہی کو یاجوج ماجوج قرار دیتے ہیں۔'' (ایضاً۔ فٹ نوٹ ۱۹۶۲)

مولانا محمد علی کی اس طویل ریسرچ کے نتائج کی صحت اور صداقت سے مولانا مودودی کو بھی اتفاق ہے۔ چنانچہ نام لئے بغیر ہی ساری باتیں دوہرا دیتے ہیں :

''یہ تو قریب قریب متحقق ہے کہ یاجوج و ماجوج سے مراد شمالی چین کے وہ قبائل ہیں جو تاتاری، منگولی، ھن اور سیتھین وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور قدیم زمانے سے متمدن ممالک پر حملے کرتے رہے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہے کہ اُن حملوں سے بچنے کیلئے قفقار (کاکیشیا) کے جنوبی علاقے میں دربند اور داریال کے استحکامات تعمیر کئے گئے تھے۔''

(تفہیم القرآن۔جلد۳ ۔ص۴۴)

حضرت یحیٰؑ کے والد حضرت زکریاؑ نبی نہ تھے ۔سبھی مفسرین حضرت یحیٰ کے والدگرامی یعنی حضرت زکریا کو نبی مانتے آئے ہیں۔لیکن مولانا محمد علی کی ریسرچ نے انہیں غیر نبی ثابت کیا۔ یہ ایک بہت بڑا اور غیر معمولی انکشاف تھا۔مولانا محمد علی لکھتے ہیں :

''زکریا۔حضرت یحیٰ کے والد کا نام ہے اور یہ نام قرآن کریم میں زمرہ انبیاء میں بھی آتا ہے ۔لوقا۱:۵ میں زکریا کے متعلق ذیل کے الفاظ ہیں :''یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانہ میں ابیّاہ کے فریق میں سے زکریا نام کاہن تھا اسکی بیوی ہارون کی اولاد میں سے تھی ۔۔۔۔اوروہ دونوں خدا کے حضور راستباز اورخداوند کے سارے حکموں اورقانونوں پر بے عیب چلنے والے تھے۔''۔۔۔۔اناجیل میں زکریا کوصرف کاہن بیان کیا گیاہے۔ البتہ پُرانے عہدنامے میں ایک نبی زکریاہ نام بیان کیا گیاہے۔ اوراس کی کتاب بھی مجموعہ عہدنامہ قدیم میں موجود ہے۔پس ممکن ہے کہ جہاں قرآن کریم نے زکریا کوزمرہ انبیاء میں فرمایا (الانعام ۶: ۸۵)۔وہاں اشارہ زکریاہ کی طرف ہی ہو کیونکہ جہاں زکریا کوانبیاء میں سے گنا ہے وہاں ان کے ہاں یحیٰ کے پیدا ہونے کا کوئی ذکرنہیں۔اور جہاں زکریا کے یہاں یحیٰ کے پیداہونے کا ذکر ہے۔ جوتین جگہ آیاہے یعنی یہاں (ال عمران۔ آیت۳۷)اورسورۃ مریم میں اورسورۃ انبیاء میں ، وہاں زکریا کونبوت عطافرمانے کا کوئی ذکرنہیں۔اورزکریاہ اورزکریا دونوں ناموں میں اس قدرمشابہت ہے کہ عربی میں آکرانکا ایک ہی صورت اختیارکرلینا کوئی بعید بات نہیں۔ بلکہ بعض مقامات کے الفاظ قرآنی اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ امرکہ مریم قرعہ اندازی سے زکریا کی سپردگی میں آئیں۔ اگروہ نبی ہوتے تو کاہنوں پرخودانکاحق فائق ہوتا۔یازکریا کا یحیٰ کے متعلق دعا کرتے ہوئے یہ کہنا **یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْب** (مریم۱۹:۶)میراوارث ہواورآل یعقوب کاوارث ہو۔ظاہر ہے کہ نبوت کی طرف اشارہ آل یعقوب میں ہے۔ورنہ یرثنی کافی تھا۔ایساہی سورۃ انبیاء میں زکریااوراسکی بی بی کا اکٹھاذکران الفاظ میں کیاہے : **اِنَّھُمْ کَانُوْا یُسٰرِعُوْنَ فِی**

الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (الانبیاء۲۱:۹۰)۔وہ بھلائیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تھے اور ہم کو امید اور خوف رکھتے ہوئے پکارتے تھے۔ان قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ زکریا نبی اور زکریا والد یحییٰ دو الگ الگ شخص ہیں۔''

(بیان القرآن۔جلد اول۔صفحہ۲۰۲۔فٹ نوٹ ۴۱۱)

یہ رائے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے بھی قبول کی ہے۔لکھتے ہیں:

''حضرت زکریاؑ جن کی تربیت میں وہ (یعنی حضرت مریم۔ناقل) دی گئی تھیں، غالباً رشتے میں ان کے خالو تھے۔اور ہیکل کے مجاوروں میں سے تھے۔یہ وہ زکریا نبی نہیں ہیں جن کے قتل کا ذکر بائبل کے پرانے عہد نامے میں آیا ہے۔''

(تفہیم القرآن۔جلد اول۔ص۲۴۸)

مولانا مودودی کے پیچ وتاب

مولانا محمد علی نے بیان القرآن میں بے شمار آیات سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات ثابت کی ہے۔مولانا موصوف کے دلائل اس قدر ٹھوس اور قوی ہیں کہ ان کو توڑنا ممکن نہیں۔یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبیداللہ سندھی، علامہ اقبال، مولانا شبلی نعمانی، علامہ محمد اسد، مولانا وحیدالدین خان جیسے مشاہیر نے صاف الفاظ میں وفات مسیح کا اعلان کر دیا ہے۔اور بقول صاحبِ ''برہان القرآن'' علامہ رحمت اللہ طارق وفات مسیح کے ٹاپک پر احمدیوں نے اتنا مواد اکٹھا کر دیا ہے کہ اس میں کسی مزید اضافے کی قطعاً گنجائش نہیں۔ لیکن مولانا مودودی نے قدامت پرستی کا بھونڈا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھنے کو تو لکھ دیا:

''جو لوگ قرآن کی آیات سے مسیحؑ کی وفات کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں وہ دراصل یہ ثابت کرتے ہیں کہ اللہ میاں کو صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے۔اعاذنا اللہ من ذالک'' (تفہیم القرآن۔جلد اول۔صفحہ۲۵۸)

لیکن تفہیم القرآن میں آگے چل کر خود ہی اس الزام کو اپنے سر لے لیا۔لکھتے ہیں:

''قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ نے ان کو (یعنی حضرت عیسیٰؑ کو۔ناقل) جسم وروح کے ساتھ کرہ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا۔اور نہ یہی صاف کہتا ہے

کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اُٹھائی گئی۔اس لئے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی قطعی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔''

(تفہیم القرآن۔جلد اول۔ص۴۲۰)

کیا مولانا مودودی کے اس بیان سے یہ ثابت نہیں ہوتا ''کہ اللہ میاں کو (نعوذ باللہ) صاف سلجھی ہوئی عبارت میں اپنا مطلب ظاہر کرنے تک کا سلیقہ نہیں ہے''۔اسی لئے جو کوئی چاہے اپنے حسب منشا و مقصد مفہوم نکال لے۔

حق تو یہ ہے کہ جہاں جہاں مولانا مودودی نے مولانا محمد علی کی رائے اور تشریح سے اتفاق کیا ہے وہاں ان کی تفسیر میں روشن خیالی اور جدت کی غیر معمولی چمک آشکارا ہوجاتی ہے۔اور جہاں انہوں نے ان کی رائے سے اختلاف دکھایا، وہیں دقیانوسیت اور قدامت پرستی نمایاں ہوگئی ہے۔ہم اپنی بات کو ایک مثال سے صاف کرنا چاہتے ہیں:

سورۃ آل عمران میں آتا ہے :

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْم بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ ط لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْھُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْم

''وہ جنہوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی اس کے بعد کہ انہوں نے زخم کھایا، جنہوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا ان کے لئے بڑا اجر ہے''۔

(ال عمرآن۔آیت۱۷۲ترجمہ محمد علی)

''اس آیت میں جس واقعہ کا ذکر ہے وہ غزوہ حمراء الاسد کے نام سے موسوم ہے۔اُحد کے واقعہ سے اگلے ہی دن نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں میں یہ منادی کرائی کہ ہم دشمن کے تعاقب میں نکلنے والے ہیں۔چنانچہ جس قدر آدمی ساتھ چل سکتے تھے وہ ساتھ ہولئے۔ادھر ابوسفیان روحاء کے مقام تک پہنچا تو مشرکین ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے کہ نہ تم نے محمد (ﷺ) کو قتل کیا نہ تمہارے ہاتھ کوئی قیدی آئے۔اس لئے انہوں نے مشورہ کیا کہ واپس لوٹ کر پھر مسلمانوں کو تباہ کریں۔مگر ابھی اسی سوچ میں ہی تھے کہ ان کو خبر پہنچی کہ مسلمان انکے تعاقب میں آرہے ہیں۔اس پر وہ ایسے

مرعوب ہوئے کہ وہاں سے فوراً کوچ کیا اور مکہ کو چلے گئے۔اور نبی کریم ﷺ یہ معلوم کر کے کہ وہ بہت دور نکل گئے ہیں۔حمراء الاسد سے مدینہ سے تین میل کے فاصلہ پر ہے واپس آ گئے۔یہ آیت بتاتی ہے کہ نبی کریم صلعم اور آپؐ کے صحابہؓ کس قدر باہمت قوم تھی کہ اس قدر تکلیف دشمن کے ہاتھ سے اٹھا کر پھر بھی اس کا تعاقب کیا۔۔۔''

(بیان القرآن۔جلد اول۔ص ۲۹۰۔فٹ نوٹ ۵۶۸)

اس موقعہ پر مولانا مودودی نے جو حاشیہ لکھا ہے، وہ یوں ہے:

''جنگ احد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دور چلے گئے تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے آپس میں کہا یہ ہم نے کیا حرکت کی کہ محمدؐ کی طاقت کو توڑ دینے کا جو بیش قیمت موقعہ ملا تھا اسے کھو کر چلے آئے۔چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ مدینہ پر فوراً ہی دوسرا حملہ کر دیا جائے۔لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس چلے گئے۔ادھر نبی ﷺ کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں۔اس لئے جنگِ احد کے دوسرے ہی دن آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے۔یہ اگرچہ نہایت نازک موقع تھا۔مگر پھر بھی جو سچے مومن تھے وہ جان نثار کرنے لئے آمادہ ہو گئے۔اور نبی ﷺ کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔اس آیت کا اشارہ انہی فدا کاروں کی طرف ہے۔''

(تفہیم القرآن۔جلد اول۔صفحہ ۳۰۳)

پھر اگلی دو آیتوں میں آتا ہے:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ (۱۷۳) فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْفَضْلٍ عَظِیْمٍ

''وہ جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگوں نے تمہارے (مقابلے کے) لئے (لشکر) جمع کیے ہیں پس ان سے ڈرو، تو اس (بات) نے انکا ایمان بڑھایا اور انہوں نے کہا اللہ ہمارے لئے کافی ہے،اور کیا ہی اچھا کارساز ہے۔پس وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ واپس

آئے انہیں کوئی دکھ نہ پہنچا اور انہوں نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔'' (ترجمہ محمد علی)

ان آیتوں سے جو حقائق نکھر کر سامنے آتے ہیں، وہ یہ ہیں :

(۱) دشمن کے بھیجے ہوئے ایجنٹ نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ڈرایا کہ اُن پر حملہ کرنے کے لئے بھاری لشکر جمع ہو رہے ہیں۔

(۲) دشمن کی فوج کے مقابلے تم تعداد اور جنگی قوت میں کم ہو اس لئے جنگ کا خیال ترک کر دو۔ اور مقابلہ کے لئے نہ نکلو۔

(۳) دشمن کے اس نفسیاتی پراپیگنڈے نے مسلمانوں کو کسی بھی طرح مرعوب یا پست ہمت نہیں کیا۔ بلکہ اس کا اثر بالکل اُلٹا پڑا۔ اُن کا ایمان یعنی اللہ پر بھروسہ اور زیادہ ہو گیا۔

(۴) انہوں نے یک زبان ہو کر یہی نعرہ بلند کیا۔ ''اللہ ہمارے لئے کافی ہے، اور وہ کیا ہی اچھا کارساز ہے''۔

(۵) ادھر اللہ نے بھی اپنے غیبی اسباب سے ایسے مواقع پیدا کر دیئے جن کی بدولت مسلمان اللہ کی نعمت اور فضل سے مالا مال ہو کر لوٹے۔ اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

چنانچہ ان آیتوں کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد علی بیان القرآن میں لکھتے ہیں :

''جب ابوسفیان اُحد کے میدان سے چلا تو اس نے بآواز بلند کہا کہ اے محمد (صلعم) ہمارے اور تمہارے درمیاں اگلے سال بدر صغریٰ پر جنگ ہوگی۔ سو جب اگلا سال آیا تو ابوسفیان اپنی قوم کے ساتھ نکلا جب مہر الظہران کے مقام پر پہنچا تو اس کا دل مرعوب ہو گیا اور اس نے واپسی کی ٹھان لی۔ اتنے میں نعیم ابن مسعود اشجعی سے ملا تو ابوسفیان نے اس سے کہا کہ میں نے محمد صلعم سے وعدہ کیا تھا کہ بدر صغریٰ پر اگلے سال ہماری تمہاری جنگ ہوگی۔ مگر کچھ خشک سالی ہے اور ہم واپس ہونا چاہتے ہیں لیکن اس طرح یہ خوف ہے کہ مسلمانوں کی جرأت بڑھ جائے گی اور وہ خیال کریں گے کہ ان لوگوں میں ہمارے مقابلہ کی طاقت نہیں۔ اس لئے تم مدینہ جاؤ اور مسلمانوں کو ڈراؤ تا کہ جنگ کے لئے نہ نکلیں اور تمہیں دس اونٹ دونگا۔ چنانچہ نعیم آیا اور اس نے مسلمانوں

کوتیاری کرتے پایا تواس نے کہا یہ بات ٹھیک نہیں پچھلے سال انہوں نے تم کوکس قدر نقصان پہنچایا اوراب وہ بہت بڑی تیاری کے ساتھ آرہے ہیں۔مگر مسلمانوں نے پروانہ کی اورکہا حَسْبُنَااللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْل چنانچہ مسلمان بدرصغریٰ پرپہنچ گئے۔جہاں بنی کنانہ کاتجارتی میلہ لگا کرتا تھا۔اس میں مسلمانوں نے تجارت کرکے بہت فائدہ اُٹھایا اور چونکہ وہاں قریش نہیں آئے اس لئے کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ادھرابوسفیان واپس مکہ میں پہنچ گیااوراہل مکہ نے اس مہم کا نام جیش السویق رکھا۔یعنی صرف ستّو پینے کی مہم تھی۔ مسلمانوں میں یہ غزوہ بدرصغریٰ کے نام سے موسوم ہے۔''

(بیان القرآن۔جلداول۔فٹ نوٹ۔۵۶۹)

پھراگلے نوٹ میں لکھاہے :

''اس آیت میں غزوہ بدرصغریٰ سے لوٹنے کا ذکر ہے۔اللہ کی نعمت اورفضل میں اُن تجارتی منافع کی طرف اشارہ ہے جواُن کووہاں حاصل ہوئے۔اور لم یمسسھم سوء میں یہ بتایاہے کہ کسی قسم کی بھی تکلیف ان کونہ پہنچی۔کیونکہ کوئی جنگ نہ ہوئی اوراللہ کی رضا کی پیروی یہ تھی کہ باوجود بھاری لشکر کاخوف دلائے جانے کے انہوں نے کچھ پروانہیں کی بلکہ اللہ کی رضا کواپنے جان ومال پرمقدم کیا۔''

(بیان القرآن۔جلداول۔فٹ نوٹ۔۵۷۰)

قرآنی بیان کے اسی پس منظر میں اب مولانا مودودی صاحب کا حاشیہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔لکھتے ہیں :

''اُحد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کی چیلنج دے گیاتھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمہارا پھرمقابلہ ہوگا۔مگر جب وعدے کاوقت قریب آیا تواسکی ہمت نے جواب دے دیا۔کیونکہ اس سال مکہ میں قحط تھا۔لہٰذااس نے پہلو بچانے کے لئے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پرایک شخص کوبھیجا جس نے مدینہ پہونچکر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کیں کہ اب کے سال قریش نے بڑی زبردست تیاری کی ہے۔اورایسا بھاری لشکر جمع کررہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کرسکے گا۔اس سے مقصد یہ تھا کہ

مسلمان خوفزدہ ہوکر اپنی جگہ رہ جائیں ۔ اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انہی پر رہے۔ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب آنحضرت ﷺ نے بدر کی طرف چلنے کے لئے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔آخر کار اللہ کے رسول نے بھرے مجمع میں اعلان کر دیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ اس پر ۱۵ سو فدا کار آپؐ کے ساتھ چلنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔اور آپ انہی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ادھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا مگر دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔آئندہ سال آئیں گے۔چنانچہ وہ اور اسکے ساتھی واپس ہوگئے۔آنحضرت ﷺ آٹھ روز تک بدر کے مقام پر اس کے انتظار میں مقیم رہے۔اور اس دوران میں آپ کے ساتھیوں نے ایک تجارتی قافلہ سے کاروبار کر کے خوب مالی فائدہ اُٹھایا۔پھر جب یہ خبر معلوم ہوگئی کہ کفار واپس چلے گئے تو آپ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔'' (تفہیم القرآن۔جلد اول۔ص۳۰۴ و ۳۰۵)

خط کشیدہ سے ممیّز عبارت کو بار بار پڑھیں ۔ یہ کہاں تک قرانی الفاظ سے میل کھاتی ہے۔کیا انسانی حرب وضرب سے بے خوف اور فقط ایک خدا پر بھروسہ کرنے والے پاکبازوں کی یہی وہ جماعت تھی جس کو فخر موجودات محمد مصطفٰے ﷺ نے تائید ایزدی سے خصوصی طور تشکیل دیا تھا؟ کیا یہی وہ فرشتہ صفت لوگ تھے جن کے بارے میں آقائے دوجہاں ﷺ نے ساری دنیا کے سامنے فخراً یہ اعلان کیا تھا **اصحابی کالنجوم**. کیا یہ وہی قدوسیوں کی جماعت تھی جس نے نبی کریم ﷺ کو یکزبان ہوکر یہ کہا تھا کہ ہم موسیٰؑ کے ساتھیوں کی طرح نہیں جو یہ کہیں کہ تم اور تمہارا خدا جنگ کے لئے جاؤ ہم یہیں انتظار کریں گے؟ نہیں جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا ہم وہاں اپنا خون بہادیں گے۔

سورۃ النور کی آیت نمبر۳۱ (''اَوْ نِسَآئِھِنَّ'') کی تشریح

سورہ نور کی اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمان خواتین کو یہ بتایا ہے کہ وہ کن کن افراد کے سامنے اظہار محاسن کر سکتی ہیں۔اسی سلسلے میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں :

" اَوْ نِسَآئِهِنَّ"

ترجمہ :''یا اپنی عورتوں کے۔''(محمد علی لاہوری)

اس آیت کریمہ کے تحت حضرت مولانا محمد علی نے ایک طویل نوٹ لکھا ہے جس میں'' اَوْ نِسَآئِهِنَّ'' کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

''اس سے مراد اکثر نے مسلمان عورتیں لی ہیں۔گویا غیر مذاہب کی عورتوں کے سامنے بھی اظہار محاسن نہیں چاہیئے۔مگر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کی عورتیں نبی صلعم کی بیبیوں کے پاس آتی جاتی تھیں (روح المعانی)۔اوراس لئے امام رازی کہتے ہیں سب عورتیں مراد ہیں۔میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ اپنی طرز کی عورتیں یا جن سے تعلقات ہوں۔کیوں کہ بعض رذیل عورتیں یا ناواقف فتنہ کا موجب ہوجاتی ہیں۔

(بیان القرآن۔جلد۲۔فٹ نوٹ ۲۳۲۴)

اب مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ اور تفسیر ملاحظہ فرمائیں :

ترجمہ۔''اپنے میل جول کی عورتیں۔''

تفسیر : ''اصل میں لفظ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے'' ان کی عورتیں''۔ اس سے کون عورتیں مراد ہیں۔۔۔اس میں فقہاء اور مفسرین کے اقوال مختلف ہیں۔ایک گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمّی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔۔۔۔دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد تمام عورتیں ہیں۔امام رازی کے نزدیک یہی صحیح مذہب ہے۔۔۔تیسری رائے یہ ہے اور یہی معقول بھی ہے۔اور قرآن کے الفاظ سے قریب تر بھی کہ اس سے دراصل ان کے میل جول کی عورتیں، ان کی جانی بوجھی عورتیں، ان سے تعلقات رکھنے والی اور کام کاج میں حصہ لینے والی عورتیں مراد ہیں۔خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔اور مقصود ان عورتوں کو اس دائرے

سے خارج کرنا ہے جو یا تو اجنبی ہوں یا ان کے اخلاق وتہذیب کا حال معلوم نہ ہو یا جن کے ظاہری حالات مشتبہ ہوں اور ان پر اعتماد نہ کیا جا سکے۔''

(تفہیم القرآن۔جلد۳۔سورہ نور۔فٹ نوٹ ۴۳)

یہاں مولانا مودودی نے حضرت مولانا محمد علی لاہوری کا نام لئے بغیر ان کی تشریح کو نہ صرف ''معقول'' کہا ہے۔ بلکہ اس رائے کو ''قرآن کے الفاظ سے قریب تر'' بھی قرار دیا ہے۔

حواؑ کا آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا جانا

اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے :

''یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا'' (۴:۱)

''اے لوگو اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔'' (ترجمہ مولانا تھانوی)

تفسیر : ''یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اول تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ پھر ان دونوں سے تمام مرد اور عورتوں کو پیدا کیا اور دُنیا میں پھیلایا۔ تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ نے پیدا کئے۔''

(گلدستہ تفاسیر۔مرتبہ مولوی عبدالقیوم۔جلد۲۔ص ۳)

اب مولانا محمد علی کا ترجمہ اور تشریح ملاحظہ فرمائیں :

''اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو، جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا۔ اور اسی سے

اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔''

تفسیر :''الفاظ میں یہ اشارہ سمجھا گیا ہے کہ آدمؑ سے اس کے جوڑے یعنی حوّا کو پیدا کیا۔اور یہ اس طرح ہوا کہ آدم کی ایک پسلی نکال کر اس سے حوا بنائی گئی۔مگر قرآن کریم نے ایسے ہی الفاظ دوسری جگہ استعمال کئے ہیں : وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم ۳۰ آیت ۲۱)۔اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے ہی نفسوں سے تمہارے لئے بیبیاں پیدا کیں تا کہ تم ان سے تسکین قلب حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحم بنایا۔اور دوسری جگہ ہے: وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (النحل ۱۶ آیت ۷۲)۔اب یہاں تمام انسانوں کو یہ کہا ہے کہ تمہاری بیبیاں تمہارے نفسوں سے پیدا کیں۔حالانکہ کہ یہ مراد نہیں کہ تمہاری پسلیوں سے پیدا کیں۔پس مرد سے عورت کے پیدا کرنے کا منشاء بھی خود قرآن کریم نے بیان فرما دیا ہے۔یعنی یہ کہ تم ایک دوسرے سے تسکین حاصل کرتے ہو اور تم میں محبت و رحم باہم اس قدر ہے کہ گویا مرد اور عورت دونوں ایک ہی ہیں۔اس لحاظ سے بھی ایک جگہ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اور دوسری جگہ مِنْهَا کا استعمال بالکل درست ہے۔کیوں کہ مرد اور عورت کا اس قدر گہرا تعلق ہے کہ گویا عورت مرد سے ہی بنی ہے یا خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا سے مراد یہ ہے کہ جس ایک جی سے اے مردو تم کو پیدا کیا اسی سے تمہاری ازواج کو پیدا کیا۔پس تم مرد اور عورت کے درمیان کوئی اس قسم کا تفرقہ نہ کرو کہ ایک کو تو گویا حقوق انسانیت حاصل ہیں اور دوسرے کو نہیں۔انسان ہونے میں عورتیں تمہارے ساتھ یکسان حقوق رکھتی ہیں، کہ جہاں سے مرد پیدا ہوا وہیں سے عورت پیدا ہوئی۔ہر رنگ میں یہ الفاظ عورت کو نہایت ہی عزت کا مقام دیتے ہیں۔ اور یہ جو خیال ہے کہ حدیث سے حوا کا آدم کی پسلی سے پیدا ہونا ثابت ہے۔یہ بھی صحیح نہیں۔پسلی

سے پیدا کرنے کا ذکر بیشک بائبل میں پایا جاتا ہے جہاں لکھا ہے : ''آدم پر ایک بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے، جو اس نے آدم سے نکالی تھی، ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا۔'' (پیدائش ۲: ۲۱ و ۲۲)۔ مگر کسی حدیث میں یہ نہیں اور جس حدیث سے یہ نکالا جاتا ہے وہ دو طرح پر بخاری میں کتاب النکاح میں آئی ہے ایک جگہ ہے **المرأۃ کالضلع** (**باب المداراۃ**) ۔عورت پسلی کی طرح ہے۔ اور دوسری جگہ ہے **واستوصوا بالنساء خیرا فانھن خُلِقْن من ضِلْعٍ** (**باب الوساۃ بالنساء**) ۔عورتوں کے حق میں بھلائی کی نصیحت قبول کرو کیونکہ وہ پسلی سے پیدا کی گئی ہیں۔ ان دونوں حدیثوں میں حوا کے حضرت آدم سے پیدا ہونے کا ذکر مطلق نہیں۔ بلکہ عام طور پر تمام عورتوں کا ذکر ہے۔ اصل میں حدیث کی ایک روایت دوسری کی خود تشریح کرتی ہے۔ **خلق من ضلع** سے کیا مراد ہے۔ **المرأۃ کالضلع** نے اس کو صاف کر دیا۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ عورتیں پسلی سے تو پیدا نہیں ہوتیں۔ پس مراد وہی ہے جو دوسری حدیث میں بیان کر دی کہ وہ پسلی کی طرح ہیں یعنی ان میں **اعوجاج** (ٹیڑھا پن) ہے۔ ایسی مثالیں خود قرآن شریف میں ہیں **خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَل** (الانبیاء ۲۱ آیت ۳۷)۔ مطلب یہ کہ اس میں جلد بازی پائی جاتی ہے۔ **اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ ضُعْفٍ** (الروم ۳۰ آیت ۵۴) یعنی تم میں ضعف پایا جاتا ہے۔۔۔'' (بیان القرآن۔ جلد دوم۔ فٹ نوٹ ۵۹۹)

مولانا مودودی کی تشریح سے پہلے ہم مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیروں سے ان کی رائے اور تشریحی بیان نقل کر دینا چاہیں گے۔ تاکہ قاریں خود دیکھ لیں کہ ان دونوں مفسروں نے بھی کس حد تک مولانا محمد علی کا اتباع کیا ہے:

مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

''تخلیق حواؑ کی تفصیلی کیفیت سے قرآن مجید تو یکسر ساکت ہے۔رہی حدیث سو اس کا بھی یہی حال ہے۔جس مشہور حدیث کی رو سے حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے اس میں ذکر نہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور نہ حضرت حواؑ کا۔ بلکہ محض عورت کی پیدائش اور کج سرشتی کا بیان ہے۔آثار میں جو روایت ملتی ہے وہ روایت توریت کی آواز بازگشت ہے۔اور توریت کا بیان حسب ذیل ہے : ''خداوند خدا نے آدم پر پیاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا۔اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا۔'' (پیدائش ۲: ۲۲و۲۳)۔۔۔۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے محض بہ طور تشبیہ کے ارشاد فرمائی گئی ہو اور مقصود محض اس کے عدم ثبات کو ظاہر کرنا ہو جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ انسان کی پیدائش جلد بازی سے ہوئی ہے۔۔۔۔'' (تفسیر ماجدی۔مطبوعہ تاج کمپنی۔ص ۲۱۰)

مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی

'' 'خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا' کے معنی ہیں اسی کی جنس سے۔اگرچہ اس کے معنی لوگوں نے اور بھی لئے ہیں۔لیکن جس بنیاد پر لئے ہیں وہ نہایت کمزور ہے۔ہم نے جو معنی لئے ہیں اس کی تائید خود قرآن میں موجود ہے۔سورہ نحل میں فرمایا ہے وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا (۷۲)۔ظاہر ہے کہ اس کے معنی یہی ہوسکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔اس کے یہ معنی کوئی بھی نہیں لے سکتا کہ یہ

بیویاں ہرایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔'' (تدبّرِ قرآن۔جلد دوم۔ص ۲۴۵و۲۴۶)

اب ہم مولانا مودودی کی تفہیم القرآن سے زیر بحث آیت کا ترجمہ اور تشریحی نوٹ پیش کرتے ہیں :

ترجمہ۔''لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا اور دونوں سے بہت مرد و عورت دُنیا میں پھیلا دیے۔''

تشریح : ''''اُسی جان سے اس کا جوڑا بنایا'' اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے علم میں نہیں ہے۔عام طور پر جو بات اہل تفسیر بیان کرتے ہیں اور جو بائیبل میں بھی بیان کی گئی ہے۔وہ یہ کہ آدم کی پسلی سے حوا کو پیدا کیا گیا (تلمود میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا) لیکن کتاب اللہ اس بارے میں خاموش ہے۔اور جو حدیث اسکی تائید میں پیش کی جاتی ہے اس کا مفہوم وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھا ہے۔لہٰذا بہتر یہ ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اس مجمل رکھا ہے۔اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔''

(تفہیم القرآن۔جلد اول ۔ص ۳۱۹ تا ۳۲۰)

ایسا لگتا ہے کہ مولانا موصوف خود بھی اس مجمل تشریح سے مطمعن نہیں۔چنانچہ ''رسائل ومسائل'' (جلد ۵ صفحہ ۳۷) پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

''حضرت حوّا کے پسلی سے پیدا کئے جانے کا عقیدہ جن احادیث پر مبنی قرار دیا جاتا ہے ان میں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ حضرت حوّا آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کی گئی تھیں۔ بلکہ ان

میں سے ایک کے الفاظ یہ ہیں کہ عورتیں پسلی سے پیدا ہوئی ہیں (استوصوا بالنساء خیرا فانھن خُلِقْن من ضِلْعٍ)، عورت کو پسلی سے تشبیہ دی گئی ہے (المراۃ کالضلع)اور تیسری میں یہ فرمایا گیا ہے کہ عورت ذات پسلی سے پیدا ہوئی ہے(المراۃ خُلقت من ضلع)مزید براں ان سب حدیثوں میں اصل موضوعِ بحث انسانی تخلیق کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ حضورؐ نے یہ بات اس غرض کے لئے بیان فرمائی ہے کہ عورت کے مزاج میں پسلی کی سی کجی ہے اس کو سیدھا کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اس کی اس فطری کجی کو ملحوظ رکھ کر ہی اس سے برتاؤ کرنا چاہیئے۔'' (ترجمان القرآن۔مئی ۱۹۶۶ء)

ایران کے مشہور شیعہ عالم ومفسر قرآن

جناب زین العابدین رہنما

محترم زین العابدین رہنما کسی تعارف کے محتاج نہیں۔دُنیائے اسلام میں اُن کو خاصی قدر ومنزلت حاصل ہے۔ان کی فارسی ''سیرت نبویؐ'' کافی مقبول ہے۔متعدد زبانوں میں منتقل ہو چکی ہے،ایک ترجمہ کشمیری زبان میں بھی چھپا ہے۔ان کی تین جلدوں پر مشتمل فارسی تفسیر القرآن بھی مشہور ہے۔اپنے ظاہری حسن واسٹائل،ترجمہ وتفسیر اور ترتیب وتدوین میں اپنے پیشرو حضرت مولانا محمد علیؒ کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بالکل ہم آہنگ ہے۔اس تفسیر کی ایک نمایاں اور قابل ذکر خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے لومۃ لایم سے بکلی بے نیاز ہو کر ان تمام مقامات کی باقاعدہ نام لیکر نشاندہی کر دی ہے۔جن کو براہ راست حضرت مولانا محمد علی کی مایہ افتخار انگریزی تفسیر سے اخذ کیا گیا ہے۔دیگر تفسیری حواشی میں بھی مولانا محمد علی کے علم الکلام کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے،یہی حال ترجمہ کا ہے۔

حضرت مولانا محمد علی نے سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت (اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن) کا ترجمہ یہ کیا ہے: "Praise be to Allah, the lord of the worlds"

محترم زین العابدین نے بالکل اسی جملے کو فارسی زبان میں پیش کیا ہے:

''ستایش خدائی را کہ پروردگار جہانیاں است''

لفظ عَالَمِیْنَ کی تشریح کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے لکھا ہے:۔

"The word translated as 'WORLDS' is *'aalameen,* which is plural of *'aalam* (from root '*ilm, to know*), indicating literally *that by means of which one knows a thing,* and hence it signifies *'world'* or *'creation',* because by it the creator is known."

ترجمہ :''قرآنی متن میں ''جہانوں'' کے لئے ''عَالَمِیْن'' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عَالَمْ کی جمع ہے۔عَالَمْ، عِلْم (یعنی جاننا) سے مشتق ہے۔یعنی وہ ذریعہ جس سے کوئی شئے جانی جا سکے۔مطلب یہ کہ عَالَمِیْن کا عِلْم ہی ہمیں حقیقی خالق سے روشناس کراتا ہے۔''

بالکل یہی بات محترم زین العابدین کے حاشیہ میں موجود ہے:

''کلمہ عَالَمِیْن جمع کلمہ عَالَمْ است۔یعنی کیھان، ریشۂ این کلمہ، علم است کہ وسیلہ شناخت۔کائنات و جہان آفرینش است۔''

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ

''ان لوگوں کے راستے (پر) جن پر تو نے انعام کیا''۔(محمد علی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے۔مولانا محمد علیؒ لکھتے ہیں:

"Those upon whom favours are bestowed are according to Ibn Abbas *the four classes mentioned in* 4:69, viz. The prophets, the truthful, the faithful and the righteous *(Bahr al Muheet).* It is in the footsteps of these spiritual leaders of the world that the Muslims aspire to walk.....According to the Holy Qur'an the favours which were bestowed upon the prophets----The gift of Divine revelation being one of them---- can still be bestowed upon the righteous who follow the right way. It should, however, be borne in mind that prophethood

and revelation are two different things, because the gift of revelation was, according to the express teachings of the Holy Qur'an, granted to others than prophets as well; as, for instance to the mother of Moses (20:38) and to the disciples for Jesus Christ (5:111). This gift of revelation or being spoken to by God, according to most authentic *Hadis*, will be granted to the righteous among Holy Prophet's followers---- *"There will be among them men to whom God will speak though they would not be prophets? (Bukhari 62:6)."* (The Holy Qur'an, Page 5)

ترجمہ :'' حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق یہ منعم علیہم پاکبازوں کے وہی چارگروہ ہیں جن کا ذکر (4:69) میں ہے۔یعنی انبیاء، صدیق، شہیداور صالح (بحرالمحیط)۔گویا سارے مسلمان دُنیا جہاں کے انہیں روحانی پیشواؤں کے نقش قدم پر چلنا چاہتے ہیں۔جوانعامات انبیاء کوعطاء کئے گئے ،اُن میں ایک انعام''وحی والہام'' بھی ہے۔اوراز روئے قرآن یہ نعمت آج بھی بزرگانِ الٰہی کوعطا کی جاتی ہے۔یادرہے کہ نبوت اوروحی والہام دومختلف چیزیں ہیں۔کیونکہ قرآن پاک کی واضح ترین تعلیمات کے مطابق یہ نعمت غیرنبیوں پربھی اُتاری گئی۔مثال کے طور پر (20:38) جہاں یہ نعمت حضرت موسیٰؑ کی والدہ کوعطا گئی اور(5:111) جہاں یہ نعمت حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں پراتاری گئی (حالانکہ وہ نبی نہ تھے)۔وحی والہام یا مکالمۂ مخاطبہ الٰہیہ وہ انعام ہے، جو اب بھی حضرت نبی کریمؐ کے برگزیدہ متبعین کوعطا کیا جاتا ہے، یہ مژدہ حضوراکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح ترین حدیث میں بھی سنایا گیا ہے۔فرمایا :اُمتِ محمدؐ یہ میں ایسے بھی لوگ ہوں گے۔جن کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمکلامی کرے گا ، حالانکہ وہ نبی نہ ہوں گے۔(بخاری شریف،62:6)۔''

اسی حاشیے کواختصار کے ساتھ فارسی زبان میں منتقل کیا گیا ہے،ملاحظہ فرمائیں:

فٹ نوٹ نمبر7،آنہا کہ نعمت خداوند شامل حالشان شدہ چہارطبقہ اند: پیامبران ، راستگویان،شہیدان ونیکوکاران۔مسلمان بایداز رفتاراین چہارطبقہ پیروی کنندتا مشمول

نعمت ہای الٰہی بشوند ومقصود شان تنہا نباید، بحد کمال رسیدن خود شان باشد بلکہ براہ راست ہدایت کردن دیگران ہم بہمان درجہ از اہمیت است۔ طبق آیہ ہائی قرآن یکی از نعمت ہای الٰہی نعمت وحی والہام است واین امر اختصاص بہ پیامبران ندارد، پیغمبری ووحی دو چیز مختلف است بہ پارسایان ونیکوکاران ہم ممکن است وحی نازل شود، چنانچہ تصریح قرآن است کہ بہ مادر موسیٰ وحی نازل شد: ''گفت اے موسیٰ درخواست تو پذیرفتہ شد وبار دیگر برتو منت نہادیم کہ بمادرت آنچہ باید وحی کردیم''۔(قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلِکَ یَا مُوْسٰی ، وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَیْکَ مَرَّۃً، اِذْ اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّکَ مَا یُوْحٰی (سورہ نمبر 20 آیت 38)۔ یا وحی والہام کہ بہ حواریون مسیح نازل شد، ''بہ حواریون وحی کردم کہ بمن وبہ پیامبرم ایمان آورند گفتند کہ ما ایمان آوردیم وتو گواہ باش کہ ما از جملہ پیروان وفرمانبردگانیم۔''وَاِذْاَوْحَیْتُ اِلَی الْحَوَارِیْنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِیْ وَبِرَسُوْلِیْ قَالُوْا اٰمَنَّا وَاشْھَدْبِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ. (سورۃ نمبر 5، آیت 111)۔(فارسی ترجمہ تفسیر۔ص 88)

سورۃ البقرہ کی دوسری آیت کے حاشیے میں لفظ ''متقی'' کی بحث کے دوران محترم زین العابدین لکھتے ہیں:

''.....ولی بیشتر مترجمان متقی را بمعنی پرہیزگار ودیندار وبیمناک از خدا ترجمہ کردہ اند۔ وسید محمد علی در ترجمہ قرآن بہ انگلیسی متقی را بکسی کہ وظائف خود را انجام میدھد ترجمہ کردہ است۔'' (فارسی ترجمہ قرآن۔صفحہ ۱۰۴۔فٹ نوٹ 9)

ترجمہ :''اکثر مترجمین نے ''متقی'' کے معنی پرہیزگار، دیندار اور خدا سے ڈرنے والا کئے ہیں۔جبکہ مولانا محمد علی نے اپنے انگریزی ترجمۃ القرآن میں ''متقی'' کے یہ معنی لکھے ہیں۔''متقی وہ ہے جو اپنے وظائف اور ذمہ داریوں (حقوق اللہ اور حقوق الناس) کو کما حقہ ادا کرے۔''

بالکل یہی بات مولانا امین احسن اصلاحی نے ایک جگہ ''تدبر القرآن'' میں کہی ہے :

''پابندیٔ حدود، جس کو شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔۔۔''

(تدبر القرآن۔جلد ۸۔ص ۱۲۸)

محترم زین العابدین کے فارسی ترجمہ قرآن میں جگہ جگہ حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کا حوالہ موجود ہے۔ اپنی تنگ دامانی کے پیش نظر ہم یہاں صرف دو اور حوالے نقل کریں گے۔

''با اینکہ یھودیاں و مسیحیاں ہر دو بیت المقدس را مرکز عبادت خود قرار دادہ بودند ولی ہیچ کدام آنرا قبلہ خود نمید انستند و مسیحیان بسوی مشرق میایستادند و ہم چنین میان یہودیان و سامریان اختلاف بود۔ اگر چہ ھر دوی آنہا از پیروان موسیٰ بودند۔ (تفسیر سید محمد علی)۔''

(فارسی ترجمہ القرآن۔ فٹ نوٹ 121۔ ص 163)

یہ حاشیہ حضرت مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کے فٹ نوٹ نمبر 189 سے ماخوذ ہے۔ حضرت مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"Notwithstanding that jews and Christians both looked to the temple at Jerusalem as their central temple, they were not agreed upon it as their *'Qiblah'* or spiritual centre. The Christians turned toward, east (Muir). Moreover, there are differences among the jews and the Samaritans, though both follow the Law of Moses."

(The Holy Qur'an, P.62.)

ترجمہ: ''باوجود اس بات کے کہ یہود و نصاریٰ دونوں ہی بیت المقدس کو اپنی مرکزی عبادتگاہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس بات پر متفق نہ تھے کہ بیت المقدس دونوں کا یکساں قبلہ ہے۔ مسیحی لوگ مشرق کی طرف منہ کرتے تھے (میور)۔ علاوہ ازیں یہودیوں اور سامریوں کے مابین بھی اختلافات پائے جاتے ہیں حالانکہ دونوں ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔''

مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًام بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ط وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَابِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ کَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ.(المائدہ.5آیت.32)

ترجمہ۔''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل کے لئے یہ مقرر کر دیا کہ جو کوئی کسی جان کو بغیر جان کے (بدلہ کے) یا زمین میں فساد کے، مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا۔اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا اور یقیناً ہمارے رسول ان کے پاس کھلی دلائل لیکر آئے پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے یقیناً زمین میں حد سے نکلنے والے ہیں۔''(ترجمہ محمد علی)

اس آیت پر جو حاشیہ انگریزی ترجمۃ القرآن میں لکھا ہے وہ یوں ہے:۔

"The reference is generally understood to be to the gravity of the crime of murder, requiring the execution of the criminal. But by the killing of a person may as well be meant the killing of the Prophet, who had come to establish righteousness. The killing of that great teacher of righteousness was indeed equivalent to the killing of all men and the saving of the life of that great saviour of humanity was equivalent to saving humanity itself. The reference is the Jewish plots against the life of the Holy Prophet, and that is the reason for mention-ing here the Israelites in particular."

(The Holy Qur'an. F.N. 689, P.250)

ترجمہ''اس آیت کو قتل کے جرم سے متعلق مانا گیا ہے۔کیونکہ یہ جرم اتنا سنگین ہے جس کی سزا موت ہے۔پر لفظ ''نَفْسٌ'' نکرہ (جان) بلحاظ عظمت نبی پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہی عظیم الشان نفس قدسی نیکی کا معلم اور مصلح ہوتا ہے جو لوگوں میں نیکی اور تقویٰ پھیلاتا ہے۔اس لحاظ سے اس اکیلے کا قتل گویا پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔اور بچایا جانا انسانیت کو زندہ رکھنا ہے۔یہاں اشارہ یہودیوں کے اس منصوبہ قتل کی طرف ہے، جو وہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بنا رہے تھے۔اسی لئے بنی اسرائیل کے ذکر کو خاص طور پر لایا گیا ہے۔''

یہی نوٹ محترم زین العابدین نے اپنے فارسی ترجمۂ قرآن میں پورے حوالے کے ساتھ نقل کیا ہے۔ملاحظہ فرمائیں :

''از این آیہ اہمیت قتل نفس ولزوم جزای بمثل مستفاد می شود۔اما سخن از قتل نفس، باز ہم ممکن

است باتوجہ بہ توطئہ قتل پیامبر باشد۔ زیرا او نیز برای راستی و پارسای ظہور کردہ بود۔ وکشتن او در حکم نابود شدن پارسای وتقویٰ، وسلامت وی بمثابۂ نجات انسانیت بود و یاد کردن از قوم بنی اسرائیل نیز نشان می دہد کہ روی سخن با یہودانی است کہ قصد قتل پیامبر را داشتند۔ (تفسیر سید محمد علی پاکستانی)''

(فارسی ترجمۃ القرآن۔ص466۔فٹ نوٹ۔472)

مفسرین کرام پر
حضرت مولانا محمد علیؒ صاحب کا اثر

1969ء میں محترم بشیر احمد سوز ایم۔اے (عربی) کو ایم اے کے لئے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے ایک تحقیقی مقالہ دیا گیا۔ جس کا عنوان تھا: ''حضرت مولانا محمد علی لاہوری بحیثیت مفسر'' یہ تحقیقی مقالہ منظور (accept) بھی کیا گیا۔ محترم سوز صاحب نے 1970ء میں اس کے چند اوراق احمدؐ یہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کے مؤقر جریدے ''روح اسلام'' میں شائع فرمائے تھے۔ یہ تحقیقی مواد یقیناً اس قابل ہے کہ اسے معزز قارئین کی نذر کیا جائے۔

پہلا اثر

جب تفسیر قرآن پر کتابیں لکھی گئیں۔ تو ان کا انداز یہ تھا کہ قریب قریب ہر آیت کے متعلق یہ کہا گیا کہ اس کا ''شانِ نزول'' یہ ہے۔ یعنی فلاں واقعہ یوں ہوا اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اس طرح قرآن کریم کی آیات کا مفہوم ان کے الفاظ کی رُو سے نہیں بلکہ ان واقعات کی روشنی میں متعین کیا گیا۔ جن کے متعلق سمجھا گیا کہ وہ ان کے نزول کا سبب تھے۔ پھر اسی مفہوم کے مطابق قرآنی الفاظ کے معنی متعین کئے گئے۔ جن سے قرآن کریم کا صحیح صحیح مطلب بیان نہیں ہوسکتا۔ یہ

بات ایک مثال کے ذریعہ سمجھ میں آجائے گی۔

سورۃ النساء کی آیت **الرجال قوامون علی النساء** کا ترجمہ یہ کیا گیا:۔

- مرد حاکم ہیں اوپر عورتوں کے (ترجمہ شاہ رفیع الدینؒ)
- مرد تسلط رکھنے والے ہیں عورتوں پر (ترجمہ سید احمد خان صاحب)

یہاں **قوامون** کا ترجمہ ''حاکم یا تسلط رکھنے والے'' کیا گیا ہے حالانکہ لغت کی رُو سے اس کے معنی کچھ اور ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں کہا گیا ہے:۔

''حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ (اس کا) مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ ایک عورت نے رسول اللہؐ کے سامنے اپنے خاوند کی شکایت کی کہ اس نے مجھے تھپڑ مارا ہے اس پر آپؐ نے بدلہ لینے کا حکم دیا ہی تھا جو یہ آیت اُتری اور بدلہ نہ دلوایا گیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک انصاری اپنی بیوی صاحبہ کو لئے ہوئے حاضر خدمت ہوئے اس عورت نے حضورؐ سے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے خاوند نے مجھے تھپڑ مارا ہے جس کا نشان اب تک میرے چہرے پر موجود ہے، آپؐ نے فرمایا کہ اسے (اس کا) حق نہ تھا۔ وہیں یہ آیت اتری کہ اَدب سکھانے کے لئے مرد عورتوں پر حاکم ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں نے اور چاہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اور چاہا تھا.....ایک اور روایت میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا اگر میں کسی کو حکم کر سکتا کہ ماسوائے اللہ تعالیٰ کے دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔''

(تفسیر ابن کبیر۔ المترجم مولوی محمد جوناگڑھی)

ان تفسیری روایات کی رُو سے مرد کی پوزیشن حاکم قرار پائی۔ **کشاف** میں **قوامون** کا مطلب **مسیطرین** یعنی داروغے اور تفسیر جلالین میں **متسلّطین** یعنی عورتوں پر غلبہ و تسلط رکھنے والے۔ اس لفظ کا یہی مفہوم کتب لغت میں بھی آ گیا اور اسی سے ہمارے ہاں اس کا ترجمہ حاکم اور تسلط رکھنے والے ہو گیا۔

تفسیری روایات کی وجہ سے قرآنی الفاظ کے مطالب و معانی جو کئے گئے ہیں۔ ان میں سے

ہم نے مثال کے طور پر ایک آیت پیش کی ہے ۔ ایسے تفسیری روایات پر مبنی الفاظ کے معانی ومطالب سے متقدّمین کی تفاسیر بھری پڑی ہیں جن سے قرآنی آیات والفاظ کا مفہوم اپنی اصل سے ہٹ چکا ہے۔

مولانا محمد علی صاحبؒ نے قرآنی الفاظ وآیات کے بارے میں روایات پر مبنی الفاظ کے معنی ومطالب پر انحصار نہیں کیا۔ بلکہ بقول ان کے ''استعمال الفاظ کے متعلق لغت کو سب سے مقدم کیا ہے۔جن معنوں کی اجازت لغاتِ عربی نے نہیں دی ان معنوں کو قبول نہیں کیا''

اور یہ کہ ''قرآن کریم میں الفاظ کے استعمال میں وسعت لغوی موجود ہے اور ایک جگہ ایک لفظ ایک معنی میں استعمال ہوا ہے تو دوسری جگہ کسی اور معنی میں استعمال ہو گیا اور یہ صرف سیاق سے ہی فیصلہ ہوسکتا ہے کہ کون سے معنی کس جگہ مراد ہیں۔''

چنانچہ وہ ''اَلرّجال قوّامون علی النسآء'' پر لغوی بحث کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

''قوامون. قوام کی جمع ہے جو قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔قام الرجل علی المرأة کے معنی ہیں مآنها یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کی۔اور قوامٌ علیها کے معنی ہیں مائنٌ لها۔یعنی اس کی روزی مہیا کرنے والا۔اور الرجال قوامون علی النساء کے معنی ہیں۔متکفلون بامور النساء مَعُنِیُّوْن بشؤنهن ۔یعنی عورتوں کے امور کے متکفل ان کے حالات پر توجہ کرنے والے (لسان العرب)۔اور تاج العروس میں ہے کہ قام الرجل المرأة اور قام علیها کے معنی ہیں مانها وقام بشانها متکفّلا بامرِها ۔یعنی اس کی مؤنت یا روزی مہیا کرنے والا اور اس کے امر کا متکفل۔پس قوام کے اصل معنی متکفل ہیں اس کے معنی محض محافظ یا محض حاکم درست نہیں اور تکفل میں روزی مہیا کرنا حفاظت کرنا اور تادیب سب امور شامل ہیں کیونکہ جو شخص جس کا متکفل ہوتا ہے۔اس کی جسمانی اور اخلاقی حفاظت بھی اس کے ذمہ ہوتی ہے۔'' (بیان القرآن ص ۵۰۰)

مولینا صاحبؒ نے ترجمہ کیا ہے:۔

(۱) ہمارے قدامت پسند دیوبندی حضرات بھی ایک چھوٹی سی کتاب بنام ''قرآن محکم۔جس کی کوئی آیت منسوخ نہیں'' شائع کر چکے ہیں۔جس کا پیش لفظ مولانا قاری طیب صاحب نے لکھا ہے۔جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جس میں ناسخ منسوخ کے غیر اسلامی عقیدہ کو پہلی بار ردّ کیا گیا ہے۔خاکسار نے قاری صاحب محترم کو اس غلط بیانی کی طرف توجہ بھی دلائی تھی، لیکن انہوں نے میرے رجسٹرڈ مکتوب کا کوئی جواب نہ دیا۔محترم رحمت اللہ طارق نے 1974ء میں ایک نہایت ضخیم کتاب ''تفسیر منسوخ القرآن'' شائع فرمائی، جو اس موضوع پر حرفِ آخر کہلانے کی حقدار ہے۔(خورشید)

''مرد عورتوں کے ذمہ دار ہیں''

الفاظ وآیات اور اصطلاحات قرآنی کی توضیح وتشریح کے سلسلہ میں مولاناؒ نے اپنی ساری تفسیر قرآن میں یہی طریق اختیار کیا ہے اور ہر ممکن یہ کوشش کی ہے کہ قرآنی الفاظ کا وہ مفہوم متعین کیا جا سکے جو ان سے نزول قرآن کے زمانہ میں سمجھا جاتا تھا۔ بعد کے مفسرّین نے مولانا کے اس اصول کو بڑی شدت سے اپنایا ہے۔ بعض مفسرین کے تراجم ملاحظہ ہوں:۔

ـــــــقوامون ''کے معنی ہیں روزی مہیا کرنے والے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ تقسیم عمل کی رُو سے مردوں کا فریضہ کسب معاش ہے۔''

(لغات القرآن۔ص۹، از غلام احمد پرویز صاحب)

''مرد عورتوں کی زندگی کے بندوبست کرنے والے ہیں''۔۔''مرد عورتوں پر قوّام ہیں''۔ (تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب)

ـــــ''مرد عورتوں کے سردھرے ہیں''۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

چنانچہ مولانا صاحب نے قرآن کے معانی متعین کرنے کا جو طریق اختیار کیا اور جسے اپنے اردو ترجمہ تفسیر بیان القرآن میں بیان کیا ہے۔ وہ طریق مابعد کے مفسرین نے اختیار کیا۔

غلام احمد پرویز صاحب قرآن کریم کے معنی متعین کرنے کا طریق یوں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ متعلقہ لفظ کے مادہ کے بنیادی مفہوم اور اس کی خصوصیت کو دیکھا جائے۔

۲۔ صحرانشینوں کے ہاں اس لفظ کا استعمال کس طرح ہوتا تھا۔

۳۔ قرآن کریم میں وہ لفظ کس کس مقام پر آیا ہے اور اس نے کس کس رنگ میں استعمال کیا ہے۔

(ملخص عبارت لغات القرآن جلد اول صفحہ ۱۷)

چنانچہ بعد کے مفسرین نے خلاف روایت الفاظ واصطلاحات قرآنی کے معنی ومطالب کی جانچ پھٹک کے لئے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے۔

دوسرا اثر:

عام طور پر یہ مان رکھا تھا کہ قرآن کریم کے اندر بعض آیات ایسی موجود ہیں جن کو دوسری

(۱) اس ستم کو دیوبند کے قدامت پسند حضرات نے بھی پہچان لیا ہے، چنانچہ دیوبند والوں نے ایک کتاب ''تفسیروں میں اسرائیلی روایات'' کے نام سے شائع کردی ہے۔ پاکستان کے مشہور عالم دین علامہ حافظ قاری حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی نے اپنے طویل تحقیق ومطالعہ کو ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' (قرآن وحدیث، تاریخ وفن رجال کی روشنی میں) کے نام سے چار جلدوں میں یکجا کردیا ہے۔ جلد اوّل کا یہ اقتباس قابل دید ہے:۔

''لیکن آج کے دور میں ہمارے علماء اپنی کم علمی کے باعث حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر مضامین کی تمام روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص بھی کسی روایت پر فن جرح وتعدیل اسماء الرجال، علم الروایہ اور علم الدرایہ کے ذریعہ بحث کرتا ہے۔ وہ یا تو منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے یا خارجی، حالانکہ یہ تمام فنون محدثین کرام نے اسی لئے وضع کئے تھے۔ کہ روایات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے رہو اور صدیوں اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن ہندو پاکستان میں یہ ایک زبردست جرم بن چکا ہے'' (مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت۔ جلد اوّل ص 412۔ 1989ء) (خورشید

آیات نے منسوخ کر دیا ہے اور پھر اس بات پر اس قدر اصرار تھا کہ جو شخص اسے نہ مانے اسے مسلمان نہ سمجھا جاتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ایک آیت دوسری سے منسوخ تب ہوگی جب وہ ایک دوسرے کے خلاف ہوگی۔ اور دونوں میں اس قدر اختلاف ہوگا کہ اگر ایک بات صحیح ہے تو دوسری غلط ہے۔ ناسخ و منسوخ کو مان کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ قرآن کریم میں اختلاف موجود ہے۔ حالانکہ خود قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۔ (النساء:۸۲) اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا یعنی انسان کا بنایا ہوا کلام ہوتا تو اس میں بہت سا اختلاف ہوتا۔ پس قرآن کریم میں اختلاف ماننا اس کو مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰه ماننے کے مرادف ہے۔ دیکھئے ناسخ و منسوخ ماننے کی زد کہاں تک پڑتی ہے۔

عام طور پر ناسخ منسوخ کا نظریہ متداول تھا اور مفسرین اسے مانتے چلے آ رہے تھے۔ مولانا نے اس نظریہ کے خلاف آواز اٹھائی اور بتایا کہ قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں جو دوسری سے منسوخ ہو اور نہ قرآن شریف میں کہیں یہ ذکر ہے کہ اس کی بعض آیات دوسری کو منسوخ کرتی ہیں، جن آیات سے یہ مطلب نکالا جاتا ہے ان کا منشاء صرف پہلی شرائع کے بعض احکام کی تنسیخ ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کی عظمت کو مولانا نے ظاہر کیا اور بعد کے مفسرین نے اس سلسلہ میں مولانا کا تتبع کیا ہے۔ آج کل اس مسئلہ پر تین مبسوط کتب مختلف مؤلفین کی دستیاب ہیں جن میں اس نظریہ ناسخ و منسوخ۔ کو غلط قرار دیا گیا ہے۔

غلام احمد پرویز اصول حل لغات کے سلسلہ میں من جملہ اور اصولوں کے ایک یہ اصول بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ:

''قرآن کریم کی پوری تعلیم کا مجموعی تصور سامنے ہونا چاہئے اور اس بنیادی اصول کو ہمیشہ

---

(۱) ہمارے قدامت پسند دیوبندی حضرات بھی ایک چھوٹی سی کتاب بنام ''قرآن محکم۔ جس کی کوئی آیت منسوخ نہیں'' شائع کر چکے ہیں۔ جس کا پیش لفظ مولانا قاری طیب صاحب نے لکھا ہے۔ جس میں یہ کہا گیا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے جس میں ناسخ منسوخ کے غیر اسلامی عقیدہ کو پہلی بار ردّ کیا گیا ہے۔ خاکسار نے قاری صاحب محترم کو اس غلط بیانی کی طرف توجہ بھی دلائی تھی، لیکن انہوں نے میرے رجسٹرڈ مکتوب کا کوئی جواب نہ دیا۔ محترم رحمت اللہ طارق نے 1974ء میں ایک نہایت ضخیم کتاب ''تفسیر منسوخ القرآن'' شائع فرمائی، جو اس موضوع پر حرفِ آخر کہلانے کی حقدار ہے۔ (خورشید)

(۱) مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ''ملفوظات'' میں اُن کا یہ بیان بھی چھپا ہے:۔

''میں حکیم نورالدین صاحب سے قادیان میں متعدد بار ملا۔ واقعی وہ بہت بڑے عالم قرآن تھے۔ میں تم سے کہوں، ہندوستان سے باہر میں کئی اسلامی ملکوں میں رہ چکا ہوں۔ اور یہاں مکہ معظّمہ میں مختلف ملکوں سے بڑے بڑے مسلمان علماء آتے رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک علوم قرآن کا اتنا بڑا عالم نہیں دیکھا جتنے حکیم نور الدین تھے۔'' (افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔

مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ 34، ناشر سندھ ساگر اکادمی لاہور)۔ (خورشید)

پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس کے مفردات اور اصطلاحات کا مفہوم اس کی مجموعی تعلیم کے خلاف نہ جائے۔ اس لئے کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں۔''

(لغات القرآن پیش لفظ ۱۷)

مولانا کے اس نظریہ کا اثر پس رو مفسرین پر نمایاں ہے۔(۱)

تیسرا اثر

مولانا نے قرآن شریف کی تفسیر کو اور اس کے ساتھ ہی گویا مذہب کو ایک علمی رنگ دیا ہے ایک زمانہ اُمتِ مسلمہ پر ایسا بھی آیا تھا کہ قرآن کریم کے معمولی واقعات کے ذکر پر خلافِ عقل وعلم قصوں کہانیوں کا رنگ چڑھا دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نئی نسل جو سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پائی تھی ان قصوں کو قرآن شریف کا حصہ سمجھ کر خود اس پرُحکمت کتاب سے متنفر ہوگئی۔ اور مذہب کو قصوں کہانیوں کا مجموعہ سمجھنے لگی۔ علماء نے بجائے اس کے کہ ان شبہات پر ان کی تشفی کراتے ہر اس شخص پر کفر کے فتوے لگانے شروع کر دیئے جو دین کے اصول نہیں بلکہ ادنیٰ جزویات میں اختلاف کا نام لے یا جو تفاسیر کے قصوں کہانیوں کو اللہ کا کلام سمجھ کر ان پر ایمان نہ لائے یا جو اعتراض اس کے دل میں پیدا ہو اس کو بیان کرے۔ مولانا نے عین اس وقت اسلام اور خود مذہب کی یہ خدمت کی کہ کفر کے فتوؤں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس طرزِ عمل کے خلاف جہاد کیا۔ اور یہ بتایا کہ قرآن کریم خلاف عقل وفہم اور علم وحقیقت قصوں اور کہانیوں سے پاک ہے اور نہ یہ کہ اس کے اندر کوئی ایسے امور نہیں جو سائنس یا عقل کے خلاف ہوں۔ بلکہ یہ بھی دکھایا کہ

---

(۱) اس سقم کو دیوبند کے قدامت پسند حضرات نے بھی پہچان لیا ہے، چنانچہ دیوبند والوں نے ایک کتاب ''تفسیروں میں اسرائیلی روایات'' کے نام سے شائع کردی ہے۔ پاکستان کے مشہور عالم دین علامہ حافظ قاری حبیب الرحمٰن صدیقی کاندھلوی نے اپنے طویل تحقیق ومطالعہ کو ''مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت'' (قرآن وحدیث، تاریخ وفن رجال کی روشنی میں) کے نام سے چار جلدوں میں یکجا کردیا ہے۔ جلد اوّل کا یہ اقتباس قابل دید ہے:۔

''لیکن آج کے دور میں ہمارے علماء اپنی کم علمی کے باعث حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر مضامین کی تمام روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص بھی کسی روایت پر فن جرح وتعدیل اسماء الرجال، علم الروایہ اور علم الدرایہ کے ذریعہ بحث کرتا ہے۔ وہ یا تو منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے یا خارجی، حالانکہ یہ تمام فنون محدثین کرام نے اسی لئے وضع کئے تھے۔ کہ روایات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے رہو اور صدیوں اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن ہندو پاکستان میں یہ ایک زبردست جرم بن چکا ہے۔'' (مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت۔ جلد اوّل۔ ص 412۔ 1989ء) (خورشید)

اس نے آج سے تیرہ چودہ سو سال پہلے ایسے ایسے علمی امور کا انکشاف کیا جن کو علمی دنیا نے آج دریافت کیا ہے۔ اصول تفسیر کی اس نئی روشنی سے آنے والے مفسرین نے فائدہ اٹھایا ہے۔ موجودہ تفاسیر کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسرائیلیات اور قصص نصاریٰ سے اور روایاتِ بے شمار سے آزاد ہیں۔(۱)

چوتھا اثر

حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ ''بیان القرآن'' کی تمہید میں لکھتے ہیں:

''میرا منشاء یہ بھی ہے کہ مسلمانوں پر قرآن کریم کے درس وتدریس کا سلسلہ عام طور پر جاری ہو۔''

جب مولانا نے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا اس وقت مسلمانوں میں قرآن کریم کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری نہ تھا۔ اس کا آغاز مولانا کی اس تحریک اور اس تعامل سے ہوا۔ مولانا صاحبؒ نے نہ صرف اس خواہش کا اظہار کیا بلکہ اس کا آغاز بھی کیا۔ آپ کے جاری کردہ درس قرآن میں بڑے بڑے اہل علم مسلمان اور زعماء شامل ہوتے تھے۔

مولانا کی اس تڑپ اور تحریک کا یہ نتیجہ نکلا کہ مفسرین مساجد اور دوسرے مقامات پر قرآن کریم کے درس دیتے ہیں۔ اور یہ سلسلہ روزانہ اور ہفتہ وار اور ماہوار جاری ہے۔ یہ امر کہ اس کا آغاز مولانا نے ہی کیا اخبار ''نوائے وقت'' لاہور میں جناب غلام مرشد صاحب کا ایک انٹرویو شائع ہوا جس میں انہوں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کے درس وتدریس کا آغاز احمدیوں نے ہی کیا ہے۔

پانچواں اثر

---

(۱) مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی ''ملفوظات'' میں اُن کا یہ بیان بھی چھپا ہے:۔

''میں حکیم نورالدین صاحب سے قادیان میں متعدد بار ملا۔ واقعی وہ بہت بڑے عالم قرآن تھے۔ میں تم سے کہوں، ہندوستان سے باہر میں کئی اسلامی ملکوں میں رہ چکا ہوں۔ اور یہاں مکہ معظّمہ میں مختلف ملکوں سے بڑے بڑے مسلمان علماء آتے رہتے ہیں۔ مجھے ان سے ملنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ میں نے آج تک علوم قرآن کا اتنا بڑا عالم نہیں دیکھا جتنے حکیم نور الدین تھے۔'' (افادات وملفوظات حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور۔ ص34)۔(خورشید)

مولانا عبیداللہ صاحب سندھیؒ نے ممالک اسلامیہ اور شرق وغرب کے علاقوں کا دورہ کیا ہے وہ اپنے دورہ کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں جہاں کہیں گیا ہوں وہاں حکیم مولوی نورالدین صاحب کے انداز تفسیر کا ہی رجحان پایا جاتا ہے(۱)۔مولانا کا یہ مشاہدہ مولانا محمد علی صاحب کی تفسیر کی اثر پذیری کا ترجمان ہے کیونکہ مولانا محمد علی نے ترجمہ وتفسیر میں حضرت حکیم مولوی نورالدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے انداز تفسیر وافکار ونظریات کو پیش کیا ہے۔مولانا خود فرماتے ہیں:۔

''اس ترجمہ کے اہم مطالب ایک ایسے شخص (حضرت حکیم مولانا نورالدین صاحب) کے ہیں جس نے اپنی ساری عمر بچپن کے زمانے سے لے کر اسی سال تک صرف قرآن کریم کے مطالعہ اور خدمت میں صرف کی ہے اور ہزار ہا کتابیں صرف اس نیت سے پڑھیں کہ کسی آیت کے حل کرنے میں مدد ملے۔'' (مجاہد کبیر ۸۱)

اور مولانا نورالدین صاحبؒ کا انداز تفسیر کیا ہے۔حکیم صاحب خود ہی فرماتے ہیں:۔

''میں نے اپنی زندگی کو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک قرآن کریم کے مطالعہ میں اور اس پر تدبر میں گذارا ہے اور جس طرح پر اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنا پاک کلام سمجھایا ہے، بہت کم لوگوں نے سمجھا ہوگا میرے مدنظر ہمیشہ سادگی اور کہانیوں سے دور رہنا اور قرآن کے ظاہر کا اتباع رہا ہے،اسی کے مطابق میں نے بھی ہمیشہ لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔'' (مجاہد کبیر،ص80)

چھٹا اثر

مولاناؒ نے اصول تفسیر میں اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر میں سب سے پہلے قرآن کریم کو لینا چاہئے۔اس کے بعد حدیث صحیح کو۔مولانا اپنی کتاب ''دین اسلام'' کے ص77 پر لکھتے ہیں:۔

''حدیث قرآن مجید کی تفسیر ہے''

حدیث کے بارے میں احتیاطی پہلو اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

(۱) ہمارے قدامت پسند علماء کے نزدیک متقدمین کی تفاسیر اور تصنیفات ہی دین کی واحد اساس اور حرف آخر ہیں۔کیونکہ وہ اجتہاد کا دروازہ بند کر چکے ہیں۔جدید مسائل اور علوم سے بے نیاز ہو کر بڑی بڑی ضخیم تفسیریں اور کتابیں لکھ کر اپنے عالم فاضل ہونے کا رُعب جماتے ہیں۔ آسانی پیدا کرنے کے بجائے چن چن کر ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اصل دِین سے بے خبر رہتا ہے۔مذہب سے متعلق اس کے ابہام اور شکوک بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:

''حضرت شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند وغیرہ کے ترجمہ قرآن اور حواشی بجائے خود کیسے ہی صحیح وقابل قدر ہوں۔مشکلین اور مذبذبین کے لئے مفید نہیں۔'' (مکتوبات سلیمانی۔جلد2۔حاشیہ 801)

اس رائے کی تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے ترجمے مشکلین اور مذبذبین کے لئے مفید نہیں،اس لئے حواشی بھی ان کے لئے مفید نہیں۔'' (ایضاً)۔(خورشید)

''حدیث بھی قرآن کریم کی تفسیر کرتی ہے لیکن صرف وہی حدیث قابل قبول ہوسکتی ہے جو ثقہ ہو اور جو قرآن کریم کی صریح تعلیم کے خلاف نہ ہو۔''

(دین اسلام از مولانا محمد علی، ص۔49)

اردو تفسیر بیان القرآن کے دیباچہ میں مذکور ہے:۔

''احادیث صحیح کو تفسیر میں اور باتوں پر مقدم کیا جائے لیکن یہاں چند باتوں میں احتیاط ضروری ہے یعنی اول کوئی حدیث خواہ وہ صحاح کی ہو قابل قبول نہیں اگر قرآن کریم کی صراحت کے خلاف ہو یا اصول دینی کے خلاف ہو۔''

اور فرماتے ہیں:۔

''قرآن مجید کو حدیث پر تقدم حاصل ہے اگر بخاری بھی قرآن مجید سے تطابق نہ کرے تو اس کو رد کر دینا چاہئے مگر کتاب اللہ کبھی رد نہیں ہوسکتی حدیث قرآن مجید کی صرف تشریح یا تفسیر ہے اور اس وجہ سے بھی قرآن مجید کو حدیث پر تقدّم ہونا چاہئے۔''

(دین اسلام۔ص77)

مولاناؒ نے تقدیم قرآن کا مسئلہ اس وقت پیش کیا جبکہ علماء اسلام نے باوجود اعتقاداً قرآن کریم کو مقدم ماننے کے فقہ کو قرآن وحدیث پر اور حدیث کو قرآن پر عملاً مقدم کیا ہوا تھا۔تمام اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہر ایک مسئلہ کے لئے خواہ وہ اصول دین سے تعلق رکھتا ہو یا فروغ سے، رجوع چار اماموں میں سے ایک کی طرف ہونا چاہئے اور اہل حدیث کے نزدیک حدیث کی طرف۔اور قرآن شریف کی طرف رجوع نہ کرنے کی دلیل یہ دی جاتی تھی کہ آئمہ قرآن کریم کو ہم سے بہتر سمجھتے تھے اس لئے کسی مسئلہ میں ہمیں اگر قرآن اور امام کے اجتہاد میں اختلاف نظر آئے تو اس صورت میں امام کا اجتہاد قابل قبول ہوگا۔کیونکہ امام قرآن کریم کو ہم سے بہتر سمجھتا تھا۔اسی طرح اہل حدیث کے نزدیک قرآن وحدیث کے مضمون میں اختلاف ہو تو حدیث قابل قبول ہے کیونکہ حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن شریف کو بہتر سمجھتے تھے۔

مولاناؒ کا اس بارے میں موقف یہ ہے کہ قرآن کریم جس طرح آنحضرت صلعم پر نازل ہوا بلا کم وکاست ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔اور حدیث نبی کریم صلعم کا کلام ہے،مگر پھر بھی اس کا

مرتبہ قرآن کریم کے برابر نہیں ، اور کہ وہ قرآن شریف کی طرح محفوظ بھی نہیں۔ کیونکہ اول تو عموماً روایت بالمعنی ہے۔اور نبی کریم صلعم کے پورے الفاظ محفوظ نہیں اور دوسرے وضعی احادیث کی ملاوٹ بھی ہوگئی ہے۔خود محدثین میں حدیث کے قابل قبول ہونے یا نا قابل قبول ہونے میں اختلاف موجود ہے۔لہٰذا اگر حدیث اور قرآن میں ہمیں کہیں اختلاف نظر آئے تو قرآن کو حدیث پر مقدم کیا جائے گا اور حدیث کی تاویل کی جائے گی اور اگر ایسی تاویل نہیں ہوسکتی، جو اسے قرآن شریف کے مطابق کردے تو اسے ترک کردیا جائے گا۔اور کہ گو فقہ آئمہ کبار کا اجتہاد ہے مگر بہر حال امام کا اجتہاد نہ قرآن کا مرتبہ رکھتا ہے نہ حدیث کا۔اور مجتہد سے بعض وقت باوجود اس کے علم، نیک ارادے کے غلطی بھی ہوجاتی ہے۔ اور فقہ کا تعلق صرف ان مور سے ہے جن کا ذکر صراحت سے قرآن وحدیث میں نہیں۔ کیونکہ اجتہاد کی ضرورت ہی تب پیدا ہوتی ہے۔جب قرآن شریف یا حدیث میں صراحت نہ ہو۔ بے شک آئمہ اور فقہاء کا علم ہم سے زیادہ تھا اور ان کا علمِ حدیث بھی ہم سے زیادہ تھا۔ پھر بھی تاویل قرآن میں کسی موقعہ پر ان سے غلطی ہوجانا ممکن ہے۔ بسا اوقات امام اجتہاد کرتا ہے لیکن اس کی توجہ ایک ایسی قرآنی آیت کی طرف نہیں جاتی جس میں اس مضمون کے متعلق صراحت موجود ہو، اور اس میں امام کے علمِ قرآن کی کوئی تحقیر نہیں ہے۔ایسا ہی حدیث کے متعلق بھی ایک امام سے غلطی ہوسکتی ہے یا اس حدیث کا اسے علم ہی نہیں ہے یا علم تھا مگر تحقیق مسئلہ میں اس کی طرف اس کی توجہ نہیں گئی۔

یہ اندازِ فکر جس کا اوپر ذکر ہوا سب مسلمان فرقوں میں پایا جاتا تھا وہ سب اپنے اپنے ائمہؒ کے اقوال کو قرآن شریف پر عملاً ترجیح دیتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن شریف کی طرف سے جو اُن کی حیات قومی کا اصل سرچشمہ تھا توجہ ہٹ گئی، اور اس کی تلاوت صرف نمازوں میں یا ثواب کے

---

(۱) ہمارے قدامت پسند علماء کے نزدیک متقدمین کی تفاسیر اور تصنیفات ہی دین کی واحد اساس اور حرف آخر ہیں۔ کیونکہ وہ اجتہاد کا دروازہ بند کر چکے ہیں۔جدید مسائل اور علوم سے بے نیاز ہوکر بڑی بڑی ضخیم تفسیریں اور کتابیں لکھ کر اپنے عالم فاضل ہونے کا رُعب جماتے ہیں۔ آسانی پیدا کرنے کے بجائے چن چن کر ثقیل اور عسیر الفہم جملوں اور ترکیبوں کا استعمال کرتے ہیں۔نتیجہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اصل دِین سے بے خبر رہتا ہے۔ مذہب سے متعلق اس کے ابہام اور شکوک بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ بقول مولانا عبدالماجد دریابادیؒ:

''حضرت شاہ عبدالقادر اور شیخ الہند وغیرہ کے ترجمہ قرآن اور حواشی بجائے خود کیسے ہی صحیح وقابل قدر ہوں۔ مشککین اور مذبذبین کے لئے مفید نہیں۔'' (مکتوباتِ سلیمانی۔جلد2۔حاشیہ 801)

اس رائے کی تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم لکھتے ہیں:

''آپ نے صحیح لکھا ہے کہ ان بزرگوں کے ترجمے مشککین اور مذبذبین کے لئے مفید نہیں، اس لئے حواشی بھی ان کے لئے مفید نہیں۔'' (ایضاً)۔(خورشید)

لئے رہ گئی۔فقہ ہی کو شریعتِ اسلام سمجھ لیا گیا اور اسلام کے سیدھے سادے عقائد میں طرح طرح کی پیچیدگیاں داخل ہوگئیں۔ یورپ کے عیسائیوں نے جو کتابیں اسلام پر لکھیں ان میں انہوں نے اپنی تحقیق کی بنیاد فقہ کی کتابوں پر رکھی اور اسلامی عقائد کو ایک خاصہ گورکھ دھندا بنا کر یورپ کو اسلام سے متنفر کرنے کی کوشش کی ہے(۱)

مولانا نے ''قران کریم۔حدیث اور فقہ پر مقدم ہے'' کے اصول کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کی تفسیر کی۔اور اسی پر تمام اصلاح وتبلیغ کی بنیاد رکھی۔نئی تفاسیر پر مولاناؒ کا یہ رنگ نمایاں ہے اکثر میں فقہ پر زور نہیں دیا گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ترجمہ وتفسیر قرآن میں اسی موقف کو پیش کیا ہے۔مولانا مودودی اپنی تفسیر تفہیم القرآن کے مقدمہ 38 پر لکھتے ہیں۔''احکام کا ماخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے۔'' یہاں مولانا نے فقہ کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

آج پاکستان بھر میں یہ آواز اُٹھ رہی ہے کہ پاکستان کا آئین قرآن وسنت کے مطابق ہو۔ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے بھی قراردادِ مقاصد کے ذریعہ یہ طے کر دیا ہے کہ اس ملک کا دستور اُسی کتاب عزیز (قرآن) کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ہوگا۔غلام احمد پرویز صاحب نے تو اس معاملہ میں ایک قدم اور بڑھایا ہے کہ وہ فقہ کے ساتھ ساتھ حدیث کا بھی انکار کر بیٹھے اور صرف قرآن اور قرآنی نظام کے داعی ہیں۔

ساتواں اثر

قرآن کریم میں بعض سورتوں کے شروع میں حروف مقطعات (الم) وغیرہ آتے ہیں یہ مقطعات درحقیقت مفردات نہیں ہیں ان کے متعلق متقدمین سے لے کر متاخرین تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اس باب میں مختلف ارباب تحقیق کی آراء مختلف ہیں۔اس حد تک قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ عربوں میں الفاظ کو مخفف کر کے بولنے کا رواج تھا۔مخفف کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ اہم الفاظ کا ایک ایک حرف لے لیا جائے اور ان حروف کے مجموعہ کو ان الفاظ کا مجموعہ تصور کر لیا جائے۔

مولانا محمد علی صاحبؒ کا موقف ہے کہ قرآن کریم بنی نوع انسان کی رشد وہدایت اور اس

کی تعلیم وتفہیم کے لئے ہے۔اس میں وہ کچھ نہیں جو انسان کے لئے نہ ہو اس لئے قرآن میں ہر حرف ہر لفظ اور ہر آیت پر انسانی غور وفکر کا اثر ہوسکتا ہے۔اور حروف مقطعات کے بارے میں عموماً متقدمین مفسرین کا یہ نظریہ رہا ہے کہ یہ ایسے حروف ہیں جن کا علم سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جانتا۔ان پر غور وفکر اور ان کے معانی نکالنا گناہ ہے۔مولانا محمد علی صاحبؒ نے ان مقطعات کے معنی کئے ہیں اور وہ ان کو بالعموم اللہ تعالیٰ کے اسماء الحسنٰی کے مخففات قرار دیتے ہیں۔مثلاً الم ''میں اللہ کامل علم رکھنے والا'' اور کھیٰعٓصٓ ''کافی۔ہادی برکت والا عالم،صادق (خدا) کے مخففات ہیں''۔مولانا ممدوح کا یہ رنگ غلام احمد پرویز صاحب کے ''مفہوم القرآن'' بشیر الدین محمود احمد ربوہ کے ترجمہ وتفسیر، پیر صلاح الدین اور دیگر انگریزی وار دو تراجم میں نظر آتا ہے۔

آٹھواں اثر

نومسلم انگریز محمد مارمیڈیوک پکتھال نے 1930ء میں انگریزی میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔ماہ نامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور نے قرآن نمبر ص 643 پر ان کے انگریزی ترجمہ قرآن کے بارے لکھا:۔

> ''تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس ترجمے کو پڑھ کر اطمینان کی سانس لی اور کہا کہ اب جا کر ہم اس قابل ہوگئے ہیں کہ اپنی کتاب دوسروں کے ہاتھ میں دے سکیں۔''

مارمیڈیوک پکتھال مولاناؒ کے علم وفضل سے متاثر ہیں اور اس کا اعتراف وہ اس طرح کرتے ہیں:

> ''کسی زندہ انسان نے اسلام کی تجدید کے لئے لاہور کے مولانا محمد علی صاحب سے زیادہ قیمتی اور طویل خدمات انجام نہیں دیں..... جو قرآن وسنت سے خوب واقف ہے.....'' (رسالہ اسلامک کلچر، اکتوبر 1936)

الحاج حافظ غلام سرور صاحب جنہوں نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ خود بھی کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

> ''پچھلے 35 سال سے مولانا محمد علی نے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ان کا انگریزی ترجمہ قرآن صرف ایک ہی کتاب نہیں ہے جو

انہوں نے لکھا ہو مگر اس کی وجہ سے ان کا نام قرآن کی خدمت کرنے والوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ 1917ء جب سے یہ ترجمہ چھپا ہے اس کی قدر و قیمت بڑھتی ہی جارہی ہے ۔ انگریزی زبان میں کوئی اور ترجمہ یا تفسیر ایسی نہیں جو مولانا محمد علی صاحب کی اس معرکتہ الآراء تصنیف کا مقابلہ کر سکے۔''

ان دونوں مترجموں کے متعلق ''مسلم ورلڈ'' جولائی 1931ء (صفحات 289-294) میں پادری زویمر لکھتے ہیں کہ :۔

''یہ دونوں اصحاب اکثر و بیشتر مولانا محمد علی کے ترجمہ کا ہی اتباع کرتے ہیں یہانتک کہ فرق معمولی الفاظ کا رہ جاتا ہے اور یہ کہ مولانا کا ترجمہ ایک نہایت وسیع وجامع اور دقیق ریسرچ پر مبنی ہے اور اس رنگ میں باقی کے تراجم اوریجنل نہیں کہلا سکتے۔''

حافظ غلام سرور صاحب اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں مولانا محمد علی صاحبؒ کے ترجمہ وتفسیر کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

''انگریزی زبان میں مولانا محمد علی کے معرکتہ الآراء ترجمہ قرآن کے مقابلہ کا کوئی اور ترجمہ یا تفسیر نہیں ہے۔ میں نے دس سال تک اس ترجمہ وتفسیر کو اپنے آپ سے جدا نہیں کیا۔ دنیا بھر میں جہاں کہیں گیا ہوں اسے اپنے ساتھ رکھا ہے۔ مکہ معظّمہ میں حج کے موقعہ پر میرے ساتھ تھا۔ 1924ء میں مذاہب کی لنڈن کانفرنس میں یہ میرے ساتھ تھا اور دوسرے اجتماعات اور مقامات پر جہاں کہیں گیا ہوں یہ قرآن میرے ساتھ رہا ہے۔''

نہ صرف دو اہل علم وقلم اصحاب پر مولاناؒ کے ترجمہ وتفسیر کا اثر تھا بلکہ اکثر و بیشتر تراجم وتفاسیر کا یہی رنگ ہے جن میں نہ صرف مولانا کے افکار ونظریات کی ہی پیروی کی گئی بلکہ اس کے تراجم بھی غیر ملکی زبانوں میں بکثرت ہوئے ۔ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ ''قرآن نمبر'' کے مطابق:۔

___ ''مدارس کے ایک اور مرہٹہ بزرگ مسٹر ونکٹا رنے مولوی محمد علی صاحب کے انگریزی ترجمہ قرآن سے تلیگو میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا۔'' (صفحہ 637)

___ ''احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور کا جرمن ترجمہ قرآن مع تفسیر بمقام برلن 1938ء میں شائع ہوا۔ یہ جرمن زبان میں پہلا مستند اور صحیح ترجمہ ہے۔ تفسیر یورپ کے مذاق اور ضروریات کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے۔'' (ص 635)

___ ''کسی یہودی نے چینی زبان میں ترجمہ کیا جس میں مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کے انگریزی ترجمہ سے مدد لی گئی ہے۔''

___ ''مسٹر نرائن راؤ ایم اے۔ ایل ٹی نے.....قرآن کریم کا ترجمہ تلیگو زبان میں کیا ہے انہوں نے مولوی محمد علی صاحب ایم اے امیر جماعت احمدیہ لاہور کے انگریزی ترجمہ سے مدد لی ہے۔''

___ ''علامہ عبداللہ یوسف علی۔ مسٹر پکتھال ان دونوں نے مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ وتفسیر سے استفادہ کیا ہے۔'' (مجاہد کبیر۔ صفحہ ۱۴۰)

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ وتفسیر سے کس قدر متاثر تھے اس کے بارے میں پچھلے اوراق میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ان کے اپنے قلم سے ایک حوالہ درج کرنا ضروری ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا نے اپنے ترجمہ وتفسیر کی تالیف میں مولانا محمد علی صاحب کے ترجمہ وتفسیر کو سامنے رکھا۔ مولانا لکھتے ہیں :۔

''ان سطور کے راقم آثم نے بھی بہت سے مخلصوں اور بزرگوں کی ہمت افزائی سے 1933ء میں اس کام کو ہاتھ لگایا۔'' خیال یہ غالب رہا کہ پکتھال، محمد علی وغیرہ کے تراجم موجود ہی ہیں اور اُردو میں بھی خاصا ذخیرہ مہیا ہے ان کی مدد سے بآسانی کام چل جائے گا۔'' (سیارہ ڈائجسٹ لاہور۔ صفحہ نمبر 643)

<u>مولانا عبدالماجد کا انداز ترجمہ وتفسیر</u> مولانا محمد علی صاحب کے انداز ترجمہ وتفسیر سے بالکل ملتا جلتا ہے۔ پہلے وہ ترجمہ عربی لغت کے مطابق کرتے ہیں پھر الفاظ وآیات کے معنی میں مختلف مقامات کے حوالہ جات بمعہ عبارت دیتے ہیں۔ پھر تفسیری مقامات میں آثار واقوال آئمہ مفسرین، تاریخ و کتب سماوی اور اپنی رائے دیتے ہیں۔ اسی قسم کی پیروی مولانا مودودی کی تفہیم القرآن میں بھی نظر آتی ہے۔ تقابلی مطالعہ میں مولانا کے انداز کو سامنے رکھا ہے۔

نواں اثر

مولانا نے اپنی تفسیر میں ہر ممکن اس پہلو کو پیش نظر رکھا ہے کہ جو کچھ غلطیاں تعلیم اسلام میں پڑ گئی ان کو دُور کیا جائے اور جو اس کی نمایاں خصوصیات لوگوں نے بھلا دی ہیں ان کو ظاہر اور روشن کیا جائے۔تا کہ اسلام پھر دنیا میں اسی طرح کشش اور جذب کا موجب بن سکے جس طرح یہ پہلے تھا۔مولانا نے بڑے دلائل و براہین سے یہ حقیقت آشکارا کی ہے کہ اسلام ایک زندہ مذہب ہے۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے۔جو انسان کی فطرت کو اپیل کرتا ہے۔اس کی کوئی تعلیم خلاف عقل نہیں۔ چنانچہ مولانا نے عقلی رنگ میں اسلام اور اصول اسلام کی صداقت کو قائم کیا ہے۔اسلام ایک علمی مذہب ہے اور ہر زمانہ میں علمی ترقیات کو پیدا کرنے کا ذریعہ رہا ہے۔مادی علوم میں ترقیات آخر انسانوں کی روحانی ترقیات کی طرف لے جائیں گی۔روحانی امور برحق ہیں ان کا انکار محض کمی علم کی وجہ سے ہے۔اور علوم کی ترقی کے ساتھ اسلام ترقی کرے گا۔جدید تفاسیر میں اب یہ رنگ نمایاں ہے۔

دسواں اثر

قرآن کریم مذہبی کتب میں شاید اکیلی کتاب ہے جس نے عقل و علم کے استعمال پر زور دیا ہے۔اسلام اپنے اصول و فروع کے لحاظ سے ایک عقلی مذہب ہے اس کی تعلیم اور اس کے عقائد کو جانچنے میں عقل کا پورا دخل ہے۔عقل اور علم دوش بدوش چلنے والی چیزیں ہیں۔قرآن کریم خلاف عقل و علم قصوں اور کہانیوں سے پاک ہے۔نہ صرف یہ کہ قرآن کریم کے اندر کوئی ایسے امور نہیں جو سائنس یا عقل کے خلاف ہوں بلکہ یہ بھی دکھایا ہے کہ اس نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر ایسے ایسے علمی امور کا انکشاف کیا ہے جن کو علمی دنیا نے آج دریافت کیا ہے۔اور واقعات اس کے کلام الٰہی ہونے پر گواہ ہیں۔گویا سائنس کو خود مذہب کا خادم بنا کر دکھایا۔مولانا نے نئے تعلیم یافتہ گروہ کی طرح مذہب کو سائنس کے ماتحت نہیں کیا بلکہ سائنس کو مذہب کے ماتحت کر کے دکھایا۔چنانچہ نئے دور کی تفاسیر میں مولاناؒ کے نظریات کی تائید کی جا رہی ہے،اور مولاناؒ کے موقف کو بڑی شرح وبسط سے پیش کیا جا رہا ہے۔اس پہلو میں مفسرین پر مولاناؒ کا اثر غالب نظر آتا ہے۔

گیارہواں اثر

مولانا کی تفسیر کے مطالعہ سے عام طور پر جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی سادہ اور صحیح تعلیم کو اور اس کے علمی اور پر حکمت اصول کو جو دنیا کے لئے موجب کشش ہے اور جن کی

وجہ سے اسلام دلوں میں گھر کر جاتا ہے اپنی اصلی صورت پر قائم کیا جائے۔ تاکہ دوبارہ اسلام میں پھر وہی جذب اور کشش پیدا ہو جائے جو پہلے تھی۔ تاکہ اسلام کا قدم پھر دنیا میں بڑھے۔ مولانا کے سینے میں جوش بھرا ہوا ہے کہ وہ اسلام کو دنیا کا غالب مذہب دیکھیں اور ان کے دل میں یہ یقین بھرا ہوا ہے کہ خواہ ظاہری سامان کیسے ہی کمزور نظر آتے ہوں اسلام یقیناً غالب ہو کر رہے گا۔

آج کی تفاسیر اسی جوش اور یقین سے معمور نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے غیر محسوس طور پر اسلام کو ایک فاتحانہ رستے پر ڈال دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام از سر نو دلوں پر قبولیت حاصل کر رہا ہے۔

بارہواں اثر

قرآن کریم اور احادیث میں بعض خارق عادت واقعات معجزات اور عظیم الشان عجیب وغریب پیشگوئیوں کا ذکر ہے۔ مولاناؒ ان کو ظاہر پر محمول نہیں کرتے بلکہ اس کے مجازی معنی مراد لیتے ہیں اور پیشگوئیوں میں اکثر استعارہ اور مجاز کو دخل دیتے اور کشوف ورؤیا کی تعبیر وتاویل کرتے ہیں۔ الفاظ ابن مریم، دابۃ الارض اور احادیث نزول ابن مریم، احادیث دجال۔ احادیث خروج یاجوج وماجوج۔ احادیث فتن اور احادیث آثار قیامت، احادیث مسیح ومہدی وغیرہ سب اسی ذیل میں لاتے ہیں (۱) اور دیگر موضوعات حقیقت صفاتِ الٰہیہ۔ عرش الٰہی۔ حقیقت ملائکہ۔ صُحُف ابراہیم۔ ہاروت ماروت۔ جن وابلیس۔ وحی الٰہی، نبوت ورسالت، اور اولیاء کی وحی۔ مسئلہ شفاعت۔ ختم نبوت، معراج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، بعثت مجددین، بعث بعد الموت، عالم برزخ،

---

(۱) الحمدللہ! اب دور حاضر کے سبھی روشن خیال علماء اسی رستہ پر چل پڑے ہیں۔ اس کی تازہ مثال بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم دین مولانا وحید الدین خان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جو انہوں نے ''قیامت کا الارم'' کے عنوان سے ''الرسالہ'' (بابت مئی 2010ء) میں شائع فرمایا ہے۔ اس فکر انگیز عالمانہ مقالے میں مولانا موصوف نے یاجوج وماجوج کا خروج، دجال کا ظاہر ہونا، مہدی کا ظہور، مسیح کا نزول، موسمیاتی تبدیلی، وفاتِ مسیح، جہاد کا اسلامی نظریہ جیسے نازک اور متنازعہ فیہ موضوعات کو کامل تحقیق وتدقیق کے بعد عام فہم زبان میں بیان کیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مدت مدید کے طویل مطالعہ اور غور وخوض کے بعد مولانا وحید الدین خان جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ بالکل وہی ہے جس کو کم وبیش سو برس سے حضرت مولانا محمد علی کی تصنیفات میں نیز دیگر احمدی لٹریچر میں دوہرایا جا رہا ہے۔ مولانا خانصاحب نے مقالے کے آخری صفحہ پر ایک نوٹ چوکھٹے میں خاص طور پر نمایاں کر کے چھاپا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:۔

نوٹ: زیر نظر مقالہ دو سال پہلے تیار کیا گیا تھا۔ اس درمیان اس مقالے کو بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کو برائے مطالعہ دیا گیا۔ انڈیا کے اندر بھی اور انڈیا کے باہر بھی۔ خاص طور پر انڈیا کے تقریباً تمام تعلیمی اداروں سے منسلک افراد کو اسے پڑھنے کے لئے دیا گیا۔ اس کو پڑھنے کے بعد تمام اہل علم نے اس سے بنیادی طور پر اتفاق کیا۔ کسی بھی عالم کی طرف سے کوئی قابل ذکر اختلاف سامنے نہیں آیا۔ اس طرح کے دو سال گزارنے کے بعد اب الرسالہ میں اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ (25 مارچ 2010ء)۔ (خورشید)

اعمالنامے۔میزان،نعماءِ جنت۔حوروغلمان۔دارالسلام،لقاءاللہ،تقدیر،تخلیق خیروشر، لوح محفوظ وغیرہ موضوعات پرمولانا نے جواپنی تفسیر میں تشریح وتوضیح کی ہے موجودہ دَور کی جن تفاسیر میں اس کا نمایاں اثر ہےان میں مشہور پولش مسلمان محمد اسد کا انگریزی ترجمہ معہ تفسیری نوٹ ہے جسے رابطہ اسلامیہ مکہ معظّمہ نے 1964ء میں شائع کیا ہے اور مندرجہ ذیل تراجم وتفاسیر بھی مولانا کے نظریات کے نمائندہ ہیں :۔

- انگریزی ترجمہ وتفسیر از غلام سرور مطبوعہ آکسفورڈ 1930ء
- انگریزی ترجمہ وتفسیر از محمد مارمیڈیوک لوک پکتھال مطبوعہ لندن 1930ء
- ترجمہ انگریزی وتفسیر از علامہ یوسف علی معہ متن 1935ء
- ترجمہ انگریزی ازمولوی شیرعلی مطبوعہ ہالینڈ۔
- ترجمہ وتفسیر از امام ایم اے بکر، کیپ ٹاؤن 1961ء
- ترجمہ ومختصر حواشی ومتن از خادم رحمان نوری شیلانگ 1964ء
- ترجمہ وتفسیر از مسٹر رائن بہ زبان تلگو
- ترجمہ وحواشی از منہاج الدین انڈونیشیا 1967ء
- ترجمہ ومبسوط حواشی حامل متن از مولانا صدرالدین صاحب، برلن جرمن 1940ء
- ترجمہ وحواشی از نومسلم محمد یوسف گرنتھی بہ زبان گورمکھی 1921ء
- ترجمہ وتفسیر از مسز ابراہیم لورا بزبان ہسپانیہ 1966

یہاں مولانا سوز صاحب کا تحقیقی مقالہ ختم ہوا۔

نوٹ ازمولف: ''انٹرنیٹ پر http://WWW.clay.smith.name نے مسلمانوں کے آٹھ مشہور انگریزی ترجموں کو ایک ایک آیت کر کے "The Parallel Qur'an" عنوان کے تحت شروع سے اخیر تک درج کیا ہے۔ایک سرسری نظر کے بعد ہی قاری کو خود بخود پتہ چل جاتا ہے کہ مابعد کے مترجمین نے مولانا محمد علی کے انگریزی ترجمۃ القرآن کا کس قدر اتباع کیا ہے۔حال ہی میں مولانا وحیدالدین خان نے ایک انگریزی ترجمہ بلامتن شائع کیا ہے (حالانکہ اس سے قبل خانصاحب کی اردو تفسیر ''تذکیرالقرآن'' کا انگریزی ترجمہ بھی منظر شہود پر آچکا تھا۔جس میں انہوں علماء کی مروجہ نہج کے پیش نظر وفات مسیحؑ کا انکار کیا ہے)۔لیکن اس جدید ترجمہ میں وفات مسیحؑ کا کھل کر اقرار ہے۔ترجمہ

کے آغاز میں قرآن پاک کے ابتدائی انگریزی مترجمین کی فہرست بھی شامل ہے۔لیکن افسوس کہ اس میں مولانا محمد علی کا نام نہیں ہے(؟)۔اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت مولانا محمد علی کی مشہور عالم انگریزی تفسیر کا ترجمہ جرمن، فرنچ، روسی، اٹالین، سپینش، ترکی، البینین اور عربی زبانوں میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔مزید آدھ درجن زبانوں میں کام ہو رہا ہے۔ایک ضخیم ہندی تفسیر پریس میں جا رہی ہے۔اس تفسیر میں مولانا محمد علی کی انگریزی اور اردو دونوں تفسیروں کو یکجا کیا گیا ہے۔یہ تفسیر بنیادی طور پر ہندو بھائیوں کے ذہن اور ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر تیار کی گئی ہے۔اس لئے اس کا پس منظر ہندومت ہے۔اور ساتھ ہی سائنس سے متعلق جدید topics کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے''۔

’’بیان القرآن‘‘

کچھ عدیم المثال شہ پارے

1 سورۃ الفاتحہ کی عظمت
2۔ منعم علیہم کون ہیں؟
3۔ اَللّٰہُ یَسۡتَہۡزِئُ بِہِمۡ کی تشریح
4۔ بنی اسرائیل کا بندر بننا
5۔ ابن مریم نام کی وجہ
6۔ غذاؤں کا اثر اخلاق پر
7۔ شراب اور جوا
8۔ عورت کی گواہی
9۔ حضرت مریم صدیقہؑ کو ملنے والا رزق
10۔ بن یامین کی بوری میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے
11۔ حضرت سلیمانؑ اور اُن کے عصا کو دیمک کے کھانے کا قصہ
12۔ آیت خَاتَمُ النَّبِیّٖن اور اُس کی تشریح
13۔ سورۃ الاخلاص

''بیان القرآن''

کچھ عدیم المثال شہ پارے

1۔سورۃ الفاتحہ کی عظمت

ابتداء میں رکھا جانے کی وجہ

صحیح احادیث میں اس کو **اعظم السور فی القرآن** کہا گیا ہے۔یعنی قرآن کریم کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت، اس کی عظمت اوّل تو خود اس سے ظاہر ہے کہ نماز میں جسے مومن کا معراج قرار دیا گیا ہے ہر رکعت میں اس سورت کا پڑھنا ضروری ہے اس کے ساتھ اور جہاں سے چاہے پڑھ لے۔ خلاصہ تعلیم قرآنی: پھر اس کا نام ام الکتاب بتاتا ہے کہ یہ سورت گویا قرآن کریم کی تعلیم کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔قرآن کریم کی اصل غرض محامد الٰہی کا بیان کرنا اور انسان کو اپنے حقیقی کمال تک پہنچانا ہے۔ چنانچہ اس سورت کے پہلے حصہ میں وہ محامد مذکور ہیں اور پچھلے حصہ میں انسانی کمال کے حصول کا ذکر ہے۔پھر اس سورت کو **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** سے شروع کر کے نہ صرف اللہ تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کا ہی ذکر کر دیا، بلکہ نسل انسانی کی بھی وحدت کی بنیاد رکھ دی اور **عالمین** کا لفظ استعمال فرما کر ساری تفریقات قومی کو دور کر دیا اور یہی مذہب کا خلاصہ ہے کہ وہ خدا کی ربوبیت اور انسانوں کی اخوت کو قائم کرے۔اور ان الفاظ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ** سے بہتر الفاظ ہیں یہ خلاصہ نہیں ہوسکتا۔

فاتحہ میں عقائد باطلہ کی تردید

پھر اس سورت کے اندر جن صفات الٰہی کا ذکر ہے وہ گویا کل صفات الٰہی کے لئے بطور اُمّ یا جڑ کے ہیں۔یعنی ربوبیت، رحمانیت، رحیمیت اور مالکیت۔انہی سے باقی صفاتِ الٰہی بھی پیدا ہوتی ہیں۔اور ان چار صفات میں دوسرا کمال یہ ہے کہ مذاہب عالم کے کل اصول باطلہ کی ان میں تردید

ہے۔صفت ربوبیت میں اس بات کا ردّ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات میں کوئی شریک ہوسکتا ہے۔ وہ رُوح اور مادہ کا بھی ربّ ہے اس لئے روح اور مادہ اس کی کسی صفت میں جیسے غیر مخلوق ہونا شریک نہیں ہوسکتے۔ایسا ہی بت پرستی اور ہر قسم کے شرک کی تردید ہے کیونکہ مستحق حمد وعبادت وہی ذات ہوسکتی ہے جو دوسروں کی ربوبیت کرے اور ربوبیت کرنے والی ذات صرف ایک ہی ہے۔ صفت رحمانیت میں جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بلا بدل رحم کرتا ہے۔کفارہ کے عقیدہ کی تردید ہے کیونکہ کفارہ کے عقیدہ کی بنیاد اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ رحم بلا بدل نہیں کرسکتا۔اس لئے اس کا بیٹا انسانوں کے گناہوں کا معاوضہ بنایا جاتا ہے۔مگر رحمانیت چاہتی ہے کہ خدا کا رحم انسانوں پر بلا بدل بھی ہو،جیسا کہ اس کی مخلوق میں ہم کو نظر آتا ہے کہ انسانوں کے پیدا ہونے سے بھی پہلے وہ ان کے لئے سامان مہیا فرماتا ہے۔صفت رحیمیت میں،جس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کے اعمال پر جو اس کے قوانین کی فرمانبرداری میں ہوں اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر دیتا ہے۔ایسے عقائد کی تردید ہے جو انسان کے اعمال کے محدود ہونے کی وجہ سے ان کے اجر کو بھی محدود قرار دیتے ہیں اور اس لئے نجات کو عارضی قرار دیتے ہیں۔صفت مالکیت میں،جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گو قوانین کی نافرمانی پر سزا دیتا ہے مگر اس کا معاملہ اپنی خلق کے ساتھ مالک کا معاملہ اپنے مِلک کے ساتھ ہے،تناسخ وغیرہ عقائد کی تردید ہے جن کی رُو سے اللہ تعالیٰ کوئی گناہ معاف نہیں کرسکتا اور اس لئے ہر گناہ کی پاداش میں انسان کو بے شمار جونوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

میانہ روی کی تعلیم

اور جس طرح عقائد باطلہ کی تردید اس حصہ میں ہے پچھلے حصہ میں ہر ایک قوم کی افراط وتفریط کی تردید ہے۔سوائے اسلام کے جس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں وہ اپنی موجودہ حالت میں صرف ایک خاص شاخِ اخلاقِ انسانی پر ہی سارا زور دیتے ہیں اور اس لئے ان میں تفریط وافراط کی غلطیاں پیدا ہوگئی ہیں،یعنی ایک شاخ پر حد سے زیادہ زور دیا اور دوسری کو بالکل نظر انداز کردیا۔اسلام کی تعلیم کا خلاصہ یہاں اعتدال یا میانہ روی قرار دیا گیا ہے جو ایک طرف تفریط سے بچاتا ہے اور دوسری طرف افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔پس یوں سورہ فاتحہ میں ہر ایک باطل کی تردید

بھی موجود ہے اور اس کے بالمقابل عقائد اور اعمال میں ان اصول حقہ کی تعلیم ہے جو بطور بنیاد کے ہیں۔

بہترین دُعا

پھر جو دعا اس سورت میں سکھائی گئی ہے وہ دعا بھی اعلیٰ سے اعلیٰ دعا ہے، جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتی۔ عیسائیوں کو اپنے خداوند کی دعا کے متعلق بہت کچھ دعویٰ ہے، مگر فاتحہ کے بالمقابل یہ دعا کچھ بھی نہیں۔ وہاں روز کی روٹی کی التجا ہے یہاں صراط مستقیم کی یعنی کمال انسانی کے حصول کی۔ اس سے دونوں دعاؤں کے مقاصد میں فرق ظاہر ہوتا ہے۔ پھر وہاں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں اس مقام پر پہنچنے کی آرزو ہے جہاں گناہ ہی انسان سے سرزد نہ ہو اور نہ کسی قسم کے حقوق میں تفریط واقع ہو نہ افراط۔ گویا یہ بے گناہ یا معصوم بن جانے کی دعا ہے۔ پس کامل اصول حقہ کے سکھانے میں، اصولِ باطلہ کی تردید میں، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا سکھانے میں اور کمال انسانی تک پہنچانے میں اس کی نظیر نہ توراتؔ میں ملتی ہے نہ انجیلؔ میں، ایسا ہی جو تعلق اللہ تعالیٰ اور اس کے عبد میں اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کے مختصر فقرہ میں قائم کیا گیا ہے وہ بھی بے نظیر ہے۔

بہترین وظیفہ

جو لوگ وظائف کے پیچھے بھٹکتے پھرتے ہیں وہ اگر افضل الدعا سے کام لیں تو بہت جلد اپنے مقاصد کو پا سکتے ہیں۔ سورہ فاتحہ سے بہتر کوئی وظیفہ نہیں اور یہ وہ وظیفہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے بندوں کو سکھایا ہے۔

2۔ منعم علیہم کون ہیں؟

اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ سے کون مراد ہیں۔ قرآن کریم خود تشریح فرماتا ہے اَلَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ (النساء۔69) یعنی وہ انبیاء اور صدیق اور شہید اور صالح ہیں۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے لے کر تمام مفسرین نے قبول کی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اِھۡدِنا کی دعا کرنے والا اعلیٰ سے اعلیٰ منازل پر پہنچنے کی دعا کرتا ہے جہاں

نبی ،صدیق ،شہید، صالح پہنچے، وہیں ہر مسلم پہنچنے کی تڑپ اپنے اندر رکھتا ہے۔عیسائیوں کی مشہور خداوند کی دعا میں گناہوں کی معافی کی التجا ہے۔ یہاں نہ صرف اس مقام کی دعا ہے کہ انسان سے گناہ ہی سرزد نہ ہو، بلکہ اس مقام پر پہنچنے کی دعا ہے جہاں بڑے بڑے برگزیدگان الٰہی پہنچے۔یعنی بڑی بڑی خدمات کے بجالانے اور بڑے بڑے کمالات کے حاصل کرنے کا اعلیٰ مقام یا اعلیٰ سے اعلیٰ مقام جس پر کوئی انسان پہنچا ہو۔پس معلوم ہوا کہ یہ دعاء روپیہ، مال، مرتبہ کے ملنے کے لئے نہیں۔کمالات، معرفت، محبت کے حصول کے لئے ہے۔

انعمت علیھم میں مقام نبوت کی دعا نہیں

یہاں نبی کا لفظ آجانے سے بعض لوگوں کو یہ ٹھوکر لگی ہے کہ خود مقام نبوت بھی اس دعا کے ذریعہ سے مل سکتا ہے اور گویا ہر مسلمان ہر روز بار بار مقام نبوت کو ہی اس دعا کے ذریعہ سے طلب کرتا ہے۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے۔اس لئے کہ نبوت محض موہبت ہے اور نبوت میں انسان کی جدوجہد اور اس کی سعی کو کوئی دخل نہیں۔ایک وہ چیزیں ہیں جو موہبت سے ملتی ہیں اور ایک وہ جو انسان کی جدوجہد سے ملتی ہیں۔نبوت اوّل میں سے ہے جیسا کہ **الرحمن علم القرآن** سے بھی ظاہر ہے۔ دنیا میں کوئی شخص کوشش کر کے اور دعائیں مانگ مانگ کر اور خدا سے التجائیں کر کے نہ پہلے نبی بنا نہ آئندہ بنے گا۔ بلکہ خود اللہ تعالیٰ **اَللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ** کے ماتحت جب چاہتا کسی کو نبوت ورسالت کے منصب پر کھڑا کر دیتا تھا، یہاں تک کہ اپنی کامل ہدایت کی راہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کھول کر تمام آنے والی نسلوں کے لئے مقام نبوت ورسالت کو ایک برگزیدہ انسان کے نام کے ساتھ مخصوص کر دیا اور اس کو **النبی** اور **الرسول** کے نام سے پکار کر بتا دیا کہ اب دوسرا نبی اور رسول نہیں ہوگا۔کیونکہ اگر دوسرا نبی بھی آجائے تو یہ الفاظ مشتبہ ہو جائیں۔پس مقام نبوت کے لئے دعا کرنا ایک بے معنی فقرہ ہے اور اسی شخص کے منہ سے نکل سکتا ہے جو اصول دین سے ناواقف ہے۔

کن کمالات کی دعا ہے

ایسے بھی لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس دعا میں حصول بادشاہت کی دعا ہے کیونکہ بادشاہت کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنا انعام قرار دیا ہے (المائدہ۔20)۔اور بعض نے اسے اور بھی

وسیع کر کے دنیا کے تمام امور میں صراط مستقیم کی دعا قرار دیا ہے۔ ادنیٰ تدبر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب باتیں دعا کے اصل مقصد سے دُور ہیں۔ بیشک بادشاہت ایک انعام ہے۔ مال ودولت بھی ایک انعام ہے، مگر یہ وہ انعامات ہیں جن میں نیک وبد شریک ہیں۔ بادشاہت ایک انعام ہے مگر ہر ایک بادشاہ منعم علیہ نہیں، دولت ایک انعام ہے مگر ہر دولتمند منعم علیہ نہیں۔ اور یہاں منعم علیہم کی راہوں کا ذکر ہے نہ خاص خاص انعامات کا مطالبہ۔ پھر منعم علیہم کے مقابلہ پر مغضوب علیہم اور ضالین ہیں جو دولت اور بادشاہت سے محروم نہیں اور نہ دنیا کے کاموں کو سرانجام دینے سے محروم ہیں، بلکہ نیکی سے محروم ہیں، اخلاق فاضلہ سے محروم ہیں۔ دعا صرف اس قدر ہے کہ جن راہوں پر نیک بندے چلتے رہے انہیں راہوں پر چلنے کی ہمیں بھی توفیق دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ ہمیں انبیاء شہدا، صلحاء کے نقش قدم پر چلا۔ اس دعا کے مقابل پر امور دنیا کی خواہشات ایک نہایت پست مقام ہے۔

اگر دعا حصول نبوت کیلئے ہے تو امت کی محرومی لازم آتی ہے

اگر یہ دعا نبوت کے حاصل کرنے کے لئے ہوتی تو کم از کم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی مقام نبوت پر کھڑا ہونے سے پہلے سکھائی جاتی۔ مگر قرآن کریم میں اس کا موجود ہونا بتاتا ہے کہ مقام نبوت ملنے کے بعد سکھائی گئی۔ نبوت عطا فرما کر اس دُعا کا سکھانا صاف بتاتا ہے کہ حصول نبوت کے لئے یہ دعا نہیں۔ اور اگر حصول نبوت کی دعا مانا جائے تو ماننا پڑے گا کہ تیرہ سو سال میں کسی مسلمان کی دعا قبول نہ ہوئی۔ حالانکہ مقربین اور محبوبین الٰہی تو ہزاروں کی تعداد میں ہو گذرے۔ خدا خود دعا سکھائے، اس کی غرض یہ ہو کہ دعا مانگنے والے کو نبوت ملے، دعا کرنے والی امت کو خیر امۃ کہا جائے اور پھر تیرہ سو سال سب کے سب محروم رہیں حتیٰ کہ وہ بھی جن کے متعلق صریح سند ہے۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

3۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ :۱۵) کی تشریح

(اللہ اُن سے مذاق کرتا ہے۔ ترجمہ محسن خان)

اِسْتِھْـــزَآءُ (لفظی ترجمہ۔ہنسی اڑانا۔ناقل) کے معنی کشاف نے لکھے ہیں۔اِنْـــزَالُ الْھَوَانِ وَالْحِقَارَۃ، یعنی ذلت اور حقارت کا نازل کرنا کیونکہ استہزا کرنے والے کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر کرنا ہوتا ہے۔روح المعانی میں ہے کہ مجازاً استہزا سے مراد تحقیر اور ذلت کا وارد کرنا ہے۔امام غزالی کہتے ہیں کہ استہزاء ایسے طریق پر تحقیر کرنے کو کہتے ہیں جس پر ہنسی آجائے۔بیضاوی میں ہے کہ استھزاء کی اصل ھزا ہے جس کے معنی خفت ہیں اور یہ معنی سرعت سے ماخوذ ہیں جس معنی میں یہ لفظ آتا ہے۔گویا استھزاء کی اصل غرض دوسرے کی تحقیر ہے اور ہنسنا ایک ذریعہ ہے جس سے وہ تحقیر کی جاتی ہے۔محض ہنسنا جس کی غرض دوسرے کی تحقیر نہ ہو استھزاء نہیں کہلاتا۔

ایک ہی الفاظ کے اللہ تعالیٰ اور انسان پر بولنے کے مفہوم میں فرق

اب یہ ایک اصول کے طور پر یاد رکھنا چاہئے کہ جب کسی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔تو وہی لفظ بولا جاتا ہے جو انسان کے لئے۔مگر یہ فرق ہمیشہ ہوتا ہے کہ انسان چونکہ ہر فعل میں آلوں اور ذریعوں کا محتاج ہے اور خدا نہیں اس لئے اس لفظ میں جو آلہ یا ذریعہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب نہیں ہوتا،صرف فعل کی آخری غرض مقصود ہوتی ہے۔مثلاً انسان دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی کا محتاج ہوتا ہے،مگر جب کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے تو آنکھ اور روشنی جو ذریعہ انسان کے دیکھنے کا ہیں وہ مراد نہیں ہوں گے۔صرف جو غرض دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ایسا ہی انسان سننے میں کان اور ہوا کا محتاج ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سننے میں یہ ذریعہ مفقود ہوگا اور اصل غرض جو سننے سے حاصل ہوتی ہے وہ مراد ہوگی۔ایسا ہی انسان کا رحم یا غضب اس کے قلب پر خاص حالت کے وادر ہونے کے ذریعہ سے پیدا ہوتا ہے مگر خدا کا رحم اور غضب صرف نتیجہ کا نام ہے۔یہی صورت استھـــزاء کے متعلق ہے جب اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا تو ہنسنا جو ذریعہ تھا وہ مفقود ہو گیا۔اور ذلیل کرنا جو اصل غرض تھی وہ باقی رہ گئی۔پس اللہ تعالیٰ کا استہزاء صرف ذلیل کرنے کا نام ہے نہ ہنسنے کا۔

کسی فعل پر سزا کا ذکر انہیں الفاظ میں

عربی زبان میں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کسی کے ایک فعل پر جو سزا دی جائے اس کو اسی فعل کے الفاظ میں ادا کیا جاتا ہے۔ابن جریر کہتے ہیں کہ جب ایک فقرہ جواب کے طور پر ہو تو اس سے مراد فی الواقع وہ فعل نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کے کسی فعل کی سزا ہوتی ہے۔خود قرآن شریف میں اس کی مثالیں ہیں وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا (الشوری. آیت 41)۔(ترجمہ۔اور بدی کا بدلہ اس کی مثل بدی (سزا) ہے۔ناقل) حالانکہ سزا فی الواقع بدی نہیں۔ فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ (البقرۃ۔آیت 194)۔(ترجمہ۔پس جو تم پر زیادتی کرے تم اسکے ساتھ اسی کے مطابق زیادتی کرو یعنی اس کو اسی کے مطابق سزا دو۔ناقل)۔حالانکہ دوسرے اعتداء سے مراد صرف سزا ہے نہ فی الواقع زیادتی۔امام راغب نے بھی اس معنی کی تائید کی ہے اور ایسا ہی لسان العرب میں ہے۔اُسی لفظ کو سزا کے لئے استعمال کرنے میں سزا کے فلسفہ کی طرف اشارہ ہے۔کہ اس کو ضرورت جائز کرتی ہے۔پس یوں بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ اللہ ان کو ان کے استہزاء کی سزا دے گا۔

4۔ بنی اسرائیل کا بندر بننا

کُوْنُوْا قِرَدَۃً خٰسِئِیْنَ (2:65)(ترجمہ۔تم بندر ہو جاؤ)۔امام مجاہد سے اس کی تفسیر یوں مروی ہے۔ قال مسخت قلوبھم ولم یمسخوا قردۃ (دُرمنثور۔ص 75) یعنی ان کے دل مسخ ہو گئے تھے اور صورتیں مسخ ہو کر بندر نہیں بنیں۔مفردات میں بھی منقول ہے قیل بل جعل اخلاقھم کاخلاقھا۔یعنی ان کے اخلاق بندروں کے سے ہو گئے۔اس تفسیر کی تائید قرآن کریم کے دیگر مقامات سے ہوتی ہے۔(النساء۔آیت 47) میں ہے۔اَوْ نَلْعَنَھُمْ کَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ یعنی ہم ان پر لعنت کریں جیسا سبت والوں پر لعنت کی۔اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں پر جو لعنت واقع ہوئی وہی لعنت اصحاب سبت پر ہوئی۔لیکن اول الذکر بندر نہیں بنائے گئے بلکہ ذلیل کیے گیے۔اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔جَعَلَ مِنْھُمُ الْقِرَدَۃَ وَالْخَنَازِیْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ط اُولٰٓئِکَ شَرٌّ مَّکَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ

السَّبِیْـــلِ. (المائدہ۔آیت ۶۰) یعنی ان میں سے بندراور سور بنائے اور وہ جس نے شیطان کی پرستش کی یہ لوگ بہت بری حالت میں ہیں اور سیدھے رستہ سے بہت دُور بھٹکے ہوئے۔اب جو لوگ بندراور سور بنے انہی کے متعلق فرمایا کہ ان کی حالت بہت خراب ہے اور سیدھی راہ سے دور چلے گئے۔ یہ انسان کو ملزم کرنے کا طریق ہے نہ حیوان کو۔اور قرآن کریم ایسے محاورات سے بھرا پڑا ہے کسی کو گدھے سے مثال دی ہے **کمثل الحمار**۔کسی کو کتے سے **کمثل الکلب**۔بندر ایک نقال جانور ہے یعنی انسان کے فعل کی نقل کرتا ہے مگر اس کے نیچے حقیقت نہیں ہوتی۔پس ان کو بندر کہنے سے مراد یہ ہے کہ وہ محض نقالی کے طور پر رسوم ادا کرتے ہیں اور ان کے افعال حقیقت سے خالی ہیں۔یا ذلت کے لحاظ سے ان کو بندر کہا ہے اور اس کی طرف **خاسئین** میں اشارہ ہے۔عربی زبان میں بندر کی مثال زنا کی کثرت کے لئے دی جاتی ہے **فلان ازنی من قرد**۔اور یہودیوں میں اس بدی کی کثرت پر بائبل گواہ ہے۔''تیرے بیچ وے ہیں جو فسق و فجور کرتے ہیں تیرے بیچ باپ کو بھی انہوں نے بے ستر کیا.....کسی نے دوسرے کی جورو سے برا کام کیا ہے اور دوسرے نے اپنی بہو سے بد ذاتی کی ہے اور کسی نے اپنی بہن اپنے باپ کی بیٹی کو تیرے درمیان خراب کیا ہے''۔(حزقیل 22-9-11) ان تمام باتوں کے لحاظ سے یہ لوگ بندر بن گئے۔

5۔ ابن مریم نام کی وجہ

''حضرت عیسیٰ کے نام کے ساتھ قرآن کریم نے لفظ ابن مریم بڑھایا ہے۔یہ عیسائیوں پر اتمام حجت کیلئے ہے کہ وہ جسے تم خدا اور بے گناہ بناتے ہو وہ ایک عورت کا بیٹا تھا۔اور انہی کی کتابوں میں لکھا ہے''اور وہ جو عورت سے پیدا ہوا ہے کیونکر پاک ٹھہرے''(ایوب 14:25)۔پھر عیسائیوں کے خیال کے مطابق گناہ مرد دنیا میں نہیں لایا، بلکہ عورت لائی۔کیونکہ عورت نے ہی آدم کو ممنوع پھل کھلایا۔پس یہ بتایا ہے کہ جب اس کی ماں موجود ہے تو تم اسے دوسرے انسانوں سے بے گناہی کا امتیاز اس بنا پر کیوں کر دے سکتے ہو۔کیونکہ جب اصلی گنہگار حوّا ہوئی اور اس کے ورثہ میں گناہ کا چلنا ضروری ہے جیسا کہ عیسائیوں کا اعتقاد ہے، تو مریم اس سے کیوں کر پاک ٹھہری۔علاوہ ازیں

حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جو شہرت دنیا میں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے خاوند کو حاصل نہیں۔اس لئے بھی مریم کی طرف منسوب کرنا اولیٰ تھا۔جیسے حضرت فاطمہ کی فضیلت کی وجہ سے بنی فاطمہ۔

﴿محترم رحمت اللہ طارق نے ''برہان القرآن''ص 303 پر لکھا ہے کہ امام محمد حبیب (860م) نے اپنی نادر روزگار تصنیف ''من نسب الی امه من الشعراء'' میں جاہلیت اور اسلام کے انتالیس ایسے شعراء کے نام دیئے ہیں جو صرف ''ماں'' کی نسبت سے پکارے گئے۔خود محترم طارق صاحب نے 66 ایسے مشاہیر کے نام نقل کئے ہیں جن کی نسبت ''ماں'' سے ہے۔جس طرح مولانا مودودیؒ حیات مسیح کے زبردست حامی ہوتے ہوئے بھی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے : ''قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ ان کو جسم وروح کے ساتھ کرۂ زمین سے اُٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا اور نہ یہی صاف کہتا ہے کہ انہوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اُٹھائی گئی۔اس لئے قرآن کی بنیاد پر نہ تو ان میں سے کسی ایک پہلو کی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔'' (تفہیم القرآن۔جلد ا صفحہ ۴۲۰)۔حیات مسیح کے عقیدے کا اس سے بڑھ کر بوداپن اور کیا ہوسکتا ہے کہ اسکو قرآن پاک کی تائید ہی حاصل نہیں۔بالکل یہی کیفیت حضرت مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کی ہے۔مولانا ابوالکلام آزادؒ نے صاف صاف لکھا ہے کہ قرآن شریف میں حضرت عیسیٰ کے بن باپ پیدا ہونے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں۔اگر بعض آیات کی ایک مخصوص انداز سے تاویل وتشریح کی جائے تو ان کا باباپ ہونا بھی ثابت ہوجاتا ہے۔(دیکھو ''انبیائے کرام''۔مرتب کردہ مولانا غلام رسول مہر)۔مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے بھی اپنی کتاب ''مطالعہ قران'' میں تسلیم کیا ہے کہ قرآن پاک میں حضرت مسیح کے بن باپ ہونے کا کوئی ذکر نہیں۔ خورشید﴾۔

حضرت مسیح کی بن باپ پیدائش اسلامی عقاید میں داخل نہیں

''عیسائی حضرت مسیح کی پیدائش بن باپ مانتے ہیں اور مسلمان بھی عموماً ایسا ہی مانتے ہیں۔مگر عیسائیوں میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بن باپ نہیں مانتے اور مسلمانوں میں بھی۔ہاں ان دونوں میں ایک فرق ہے۔اگر فی الواقع حضرت مسیح بن باپ پیدا نہیں ہوئے تو اس سے مسلمانوں کے کسی عقیدہ میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا۔کیونکہ ان کو بن باپ پیدا شدہ ماننا ان کے عقاید میں داخل

نہیں۔لیکن عیسائیت کی عمارت کی بنیاد ہی اکھڑ جاتی ہے اگر یہ ثابت نہ ہو سکے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے تھے۔کیونکہ اگر وہ باپ رکھتے تھے تو نہ روح القدس سے حضرت مریم حاملہ ہوئیں۔نہ مسیح میں الوہیت تھی نہ کفارہ صحیح رہا۔پس حضرت مسیح کا بن باپ پیدا نہ ہونا عیسائیت کو بیخ و بن سے اُکھاڑتا ہے۔اور اسلام کا اس سے کچھ نہیں بگڑتا۔ایک مسلمان حضرت مسیح کی نبوت کا اس صورت میں بھی قائل ہے کہ وہ بن باپ پیدا ہوئے ہوں اور اس صورت میں بھی کہ با باپ پیدا ہوئے ہوں۔وہ صرف اس قدر دیکھ لے گا کہ قرآن کریم نے کیا فرمایا ہے یا نبی کریم صلعم کی احادیث سے کیا ثابت ہے۔اگر ان دونوں میں بن باپ پیدا ہونا مذکور ہو تو مان لے گا ورنہ نہیں۔۔۔۔پس ہم نے صرف اس قدر دیکھنا ہے کہ قرآن شریف یا احادیث نبوی سے اس بارہ میں کیا معلوم ہوتا ہے۔

اب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ اس نے نسل انسانی کے لئے یہ قانون بنایا ہے ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ (السجدۃ ۳۲۔آیت ۸)۔یعنی آفرینش اول کے بعد اسکی نسل کو نطفہ سے چلایا ہے۔اور فرماتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاج (الدھر ۷۶ آیت ۲)۔ہم نے انسان کو مرد عورت کے ملے ہوئے نطفہ سے پیدا کرتے ہیں۔پس جب تک اللہ تعالیٰ بالتصریح یہ نہ فرمائے کہ عیسیٰ کو ہم نے اپنے اس قانون کے خلاف یا الگ رنگ میں پیدا کیا تھا اس وقت تک یہی ماننا ہوگا کہ وہ اسباب جو اللہ تعالیٰ نے پیدا کئے وہ اسی رنگ کے تھے۔یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت پر کوئی سوال نہیں کہ اس کو ایسا کرنے کی قدرت ہے یا نہیں۔اُس کو بغیر باپ چھوڑ کر ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا کرنے کی قدرت ہے۔سوال صرف یہ ہے کہ قرآن شریف سے یا حدیث صحیح سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا کیا۔۔۔اگر کوئی شخص قرآن کریم کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کا بن باپ ہونا تسلیم کیا گیا ہے تو ایسا مانے۔میرے نزدیک یہ نتیجہ الفاظ قرآنی سے نہیں نکلتا۔گو میں اس مسئلہ کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا مگر تاہم مَیں سمجھتا ہوں کہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ نیک نیتی سے جو کچھ منشائے قرآن سمجھے اس کو ظاہر کردے۔ وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ترجمہ۔اور جس نے اپنی عصمت کو محفوظ کیا (الانبیاء ۲۱ آیت ۹۱) سے بھی اس کے خلاف دلیل نہیں پکڑی جاسکتی۔کیونکہ احصان کے معنی قید نکاح میں آنا ہے۔۔۔حدیث ایک بھی ایسی نہیں ملتی کہ نبی کریم صلعم نے فرمایا ہو کہ حضرت عیسیٰ بن باپ پیدا ہوئے۔بلکہ آپؐ کی جو گفتگو وفد نجران کے ساتھ لکھی ہے (یہ گفتگو تفسیر ابن جریر، تفسیر کبیر،

تفسیر روح المعانی اور تفسیر دُرّ منثور میں موجود ہے)۔۔۔۔اس میں نبی کریم صلعم کے یہ صاف الفاظ مروی ہیں **الستم تعلمون ان عیسیٰ حملته امرا ة کما تحمل المراة** کیا تم نہیں جانتے کہ عیسیٰ کو اس کی ماں نے حمل میں لیا جس طرح عورتیں بچوں کو حمل میں لیا کرتی ہیں۔اور عورتیں بچوں کو اپنے خاوندوں سے ہی حمل میں لیتی ہیں۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر صفائی سے جب عیسائیوں نے یہ سوال کیا **وقالوا له من ابوه** یعنی اسکا باپ کون ہے؟ تو آپؐ نے یہ جواب نہیں دیا کہ اسکا باپ کوئی نہیں۔ بلکہ جواب میں فرمایا **الستم تعلمون انه لایکون ولد الا و هو یشبه اباه** کیا تم نہیں جانتے کہ کوئی بیٹا نہیں مگر وہ اپنے باپ سے مشابہ ہوتا ہے۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپؐ نے یہ بتا دیا کہ حضرت عیسیٰ کا باپ انسانوں میں سے ہی کوئی ہے۔ کیونکہ اس کی شکل انسانوں سے ملتی ہے۔اگر آنحضرت صلعم نے اس بات کو ظاہر کرنا ہوتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوا تو جیسا کہ اکثر مفسرین نے لکھا ہے، یوں فرماتے کہ وہ آدم کی طرح بن (ماں) باپ ہے یا کلمہ کُن سے پیدا ہوا ہے۔پس یہ تمام امور اس بات پر دلیل ہیں کہ قرآن کریم حضرت عیسیٰ کی پیدائش بن باپ بیان نہیں کرتا۔۔۔۔'' (بیان القرآن۔ص۲۱۳ تا ۲۱۴)

﴿حدیث میں حضرت فاطمہؓ کے بارے میں آتا ہے **اِنَّ فَاطِمَةَ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا** یعنی حضرت فاطمہؓ وہ خاتون تھیں جنہوں نے اپنی عصمت کو محفوظ کر لیا تھا۔(حوالہ کے لئے دیکھیں ڈاکٹر طاہر القادری کی تالیف ''**الدر ة البیضاء فی فاطمة الزهراء**'' ۔یہ وہی الفاظ ہیں جو حضرت مریم کے لئے آئے ہیں۔تو کیا حضرت فاطمہؓ شوہر والی خاتون نہ تھیں؟ علامہ اقبال بھی حضرت مسیح کو عام انسانوں کی طرح بابا پ ہی مانتے تھے (دیکھو 'مجالس اقبال'۔مرتب جعفر بلوچ۔ص۸۲ نیٹ پر دستیاب) (خورشید)﴾

6۔ غذاؤں کا اثر اخلاق پر

یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ کُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ:۱۶۸)

''اے لوگو! اُس سے جو زمین میں ہے حلال اور پاکیزہ کھاؤ۔اور شیطان کے قدموں کے پیچھے نہ چلو۔''

''جب ہدایت کے اصل الاصول توحید کا ذکر کیا تو اب کسی قدر ذکر ہدایت کی تفصیلات کا کیا

ہے اور بتایا ہے کہ کھانے پینے تک کے احکامات بھی شریعت میں دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ غذاؤں کا اثر اخلاق وروحانیت دونوں پر پڑتا ہے۔ یہاں سے لیکر اکتیسویں رکوع تک یہ ذکر چلے گا مگر عموماً انہیں احکام کو بیان کیا ہے جن کا تعلق صبر سے ہے کہ کیونکہ یہی اصل مضمون ہے جس پر بحث شروع ہے۔ اس میں سب سے پہلی ضرورت حلال کھانے کی بتائی۔ جو مال باطل طریق پر حاصل کیا جائے وہ حلال نہیں ہوسکتا۔ دوسری ضرورت طیب کھانے کی بتائی یعنی ستھری چیز۔ اس ایک لفظ کو لاکر بہت سی تفصیلات سے مستغنیٰ کردیا۔ اور کسی قدر اختلاف رواج سے بھی طیب کا اختلاف پیدا ہوسکتا ہے اس لئے عام لفظ رکھا۔ **یـایھـا النـاس** میں جو حکم دیا ہے وہ عام ہے۔ حرام خوری کو ترک کرنے سے بھی اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سعد بن ابی وقاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کس طرح مستجاب الدعوات بنوں تو آپؐ نے فرمایا **اَطِبْ مَطْعَمَکَ تَکُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَۃِ**. ستھرا کھانا کھاؤ مستجاب الدعوۃ ہوجاؤ گے۔ دنیا اور دین، ظاہری اور باطنی طہارت کے احکام کو کس طرح ملایا ہے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کا تعلق

خود قرآن شریف نے بھی غذا کے حکم کے بعد یہ لفظ لاکر کہ شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ باطنی طہارت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غذا بھی اچھی کھاؤ۔ اخلاق بھی اچھے دکھاؤ۔ جیسا کہ اگلی آیت میں شیطان کی پیروی نہ کرنے کی وضاحت کردی کہ بدی اور بے حیائی کی باتوں سے بچو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم انسان کی جسمانی اور روحانی حالتوں میں ایک تعلق بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جسمانیات کی طرف سے مضمون کو روحانیات کی طرف اور روحانیات سے جسمانیات کی طرف منتقل کرتا ہے۔

بدی اور بے حیائی کا تعلق غذاؤں سے

یہاں یہ اشارہ ہے کہ حرام غذاؤں کے استعمال سے سوء اور فحشاء پیدا ہوتے ہیں۔ جیسے مثلاً مردار اور خون کے کھانے سے صحت جسمانی پر برا اثر اور گندے اخلاق، خنزیر کھانے سے بے حیائی۔ اور افترا علی اللہ اسے اس لئے کہا کہ وہ لوگ خود چیزوں کو حلال وحرام قرار دے کر اللہ تعالیٰ

کی طرف منسوب کرتے تھے۔آج یہ امر مسلم ہے کہ ہر ایک قسم کی غذا اسی قسم کی صفات انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔مگر قرآن کریم نے آج سے تیرہ سو سال پیشتر اس حقیقت کی طرف توجہ دلا کر ایسی چیزوں سے روکا۔'' (بیان القرآن۔ص ۹۷)

(اس نکتہ کو مابعد کے متعدد مفسرین نے اپنی تفسیروں میں پیش کیا ہے۔خورشید)

7۔ شراب اور جوا

قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا (البقرہ:219)

''کہہ ان دونوں میں بڑی برائی ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور ان کی برائی ان کے فائدے سے بڑھکر ہے۔''

شراب اور جوا مہذب قوموں کی اور بالخصوص عیسائی اقوام کی دو خطرناک بیماریاں ہیں اور ان کا علاج سوائے اسلام کے اور کسی مذہب نے نہیں کیا۔بعض بدیاں ایسی موٹی ہیں کہ ان کے بد نتائج تک سب کی نظر پہنچ جاتی ہے اور بعض کے بدنتائج چونکہ ایک مدت کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں اس لئے ہر ایک کی نظر ان تک نہیں پہنچ سکتی۔شراب مؤخر الذکر بدیوں میں سے ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے اکیلے کامل مذہب نے ہی شراب کے بدنتائج کو دیکھ کر اس سے روکا۔یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی، بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی ہے۔دیکھو قاضیون 9:13-2۔ سموئل 2:16-1، مثال 6:31۔حکمائے یہود نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔یجروید میں جو چیزیں دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔منوسمرتی میں ہے کہ ''مانس اور شراب اور ان دونوں کے کھانے میں کچھ دوش نہیں۔'' منوسمرتی سے ہی یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کچھ دوش نہیں۔عیسائیت نے تو حد ہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر گویا رکھ دی۔انجیل، (یوحنا 2:1-11) میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ ہی یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں جب شراب کچھ کم ہوگئی اور لوگ پورے بدمست نہ ہوئے تو حضرت مسیح نے پانی کے مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کیا۔یوں کہنا

چاہیئے کہ اس معجزہ میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک دفعہ شراب نہ پیئے۔ کیونکہ عید فسح میں شراب جز ولازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کا قائم مقام قرار دے کر اتحاد عیسائیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ گویا عیسائیت کا اجتماع روٹی کے ٹکڑے اور شراب کے پیالہ پر ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راستباز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گو وہ دوسروں کو اس سے نہ روک سکے ہوں۔ اور یہودیوں میں تو دو فرقے ایسے تھے جو شراب نہ پیتے تھے۔ مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لئے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوائے اور کسی کو نہیں دی گئی۔ اور آپ کی یہ قوت قدسی اس کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کو بچانا بھی مشکل ترین کام ہے۔ اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جس میں شراب بنائی جاتی تھی۔ حالانکہ آپ کے ظہور کے وقت عرب کے ملک میں اس قدر کثرت سے شراب پی جاتی تھی کہ اس کی نظیر سوائے موجودہ زمانہ کے یورپ کے اور کہیں نہیں ملتی۔ ادھر حرمت شراب کے حکم کا نازل ہونا تھا ادھر شراب مدینہ کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔ لوگ خارق عادت امور میں معجزات تلاش کرتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کون سا اعجاز ہوگا جس نے آن کی آن میں نسل انسانی کو اس خبیث چیز سے آزاد کر دیا۔ آج امریکہ بھی تیرہ سو سال بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کی نقل کرنے لگا ہے مگر کہاں نبی کی قوت قدسی جو فوراً قوم کو پاک صاف کر دیتی ہے کہاں دنیا داروں کے ریزولیوشن جن سے بچنے کے لئے طرح طرح کے حیلے بھی سے نکالے جا رہے ہیں۔

حرمت شراب کی تدریج میں حکمت

ہاں یہ بھی سچ ہے کہ اسلام نے جو فطرت انسانی کو پہچانتا ہے حرمت شراب کا حکم تدریجاً پہنچایا حالانکہ اور کسی بدی کی بیخکنی میں تدریج روا نہیں رکھی۔ چنانچہ اوّل یہ سمجھایا کہ اس میں کچھ فوائد تو ضرور ہیں جن کی وجہ سے دنیا آج تک اس میں مبتلا رہی مگر اس کا نقصان نفع سے بہت بڑھ

کر ہے، اور پھر فرمایا کہ نشہ کی حالت میں نماز میں مت آؤ لَاتَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (النساء43) یعنی شراب نوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا نہیں ہوسکتا۔ اور بالآخر قطعی حکم حرمت سورہ مائدہ میں نازل فرمایا۔ اس کو رجس (پلیدی) قرار دیا اس کو شیطان کا کام کہا۔ فاجتنبوا (اس سے بچو) کا حکم دیا اور آخر میں فھل انتم منتھون میں تاکید کے ساتھ زجر فرمایا۔ پس اس تدریجی مگر قطعی حکم حرمت شراب میں بھی ایک حکمت تھی۔

شراب تھوڑی اور بہت یکساں حرام ہے

یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ گو خمر کی حرمت اسی وجہ سے ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح دیگر نشہ پیدا کرنے والی اشیاء بھی اس حرمت کے اندر آجاتی ہیں۔ مگر یہ حرمت عام ہے یعنی یہ مطلب نہیں کہ تھوڑی شراب جس سے نشہ نہ ہو پی لینا جائز ہے۔ خصوصیت وجہ سے عمومیت حکم پر اثر نہیں پڑتا۔ اور حدیث میں صاف ہے۔ حرمت الخمر لعینھا قلیلھا و کثیرھا ۔ یعنی شراب فی ذاتہٖ حرام ہے تھوڑی ہو یا بہت اور یہ بھی ہے ماسکر کثیرہ فقلیلہ حرام جس چیز کی زیادہ مقدار سے نشہ ہو جائے یعنی انسان بدمست ہو جائے وہ تھوڑی بھی حرام ہے۔ اسی طرح خاص قسم کی شرابوں کا جواز نکالنا حکم قرآنی کا ابطال ہے ۔ ہاں البتہ دوائی کے طور پر شراب کا استعمال ناجائز نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ دوائی کے طور پر تھوڑی مقدار میں زہر بھی دی جاسکتی ہے ۔ حدیث میں ہے کہ حرام سے دوا نہ کرو۔ مگر حالت اضطرار میں سؤر بھی جائز ہے اس لئے حالتِ اضطرار اس سے مستثنیٰ ہے۔

8۔ عورت کی گواہی

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ ط وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌم بِالْعَدْلِ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ فَلْیَکْتُبْ وَلْیُمْلِلِ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْحَقُّ وَلْیَتَّقِ اللّٰہَ رَبَّہٗ وَ لَا یَبْخَسْ مِنْہُ شَیْئًا ط فَاِنْ کَانَ الَّذِیْ عَلَیْہِ الْحَقُّ سَفِیْھًا اَوْ ضَعِیْفًا اَوْ لَا یَسْتَطِیْعُ اَنْ یُّمِلَّ ھُوَ فَلْیُمْلِلْ وَلِیُّہٗ بِالْعَدْلِ ط وَاسْتَشْھِدُوْا شَھِیْدَیْنِ مِنْ رِّجَالِکُمْ فَاِنْ

لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى (البقرہ:۲۸۲)۔''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقررہ وقت کے لئے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو۔اور چاہیئے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے۔اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا اللہ نے اسے سکھایا۔اور ضرور لکھ دے اور چاہیئے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے ۔۔۔۔۔اور دو گواہ اپنے مردوں میں سے گواہی کے لئے بلالیا کرو۔پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں جنکو تم پسند کرو۔تا کہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلا دے۔۔۔۔۔''

اس آیت میں ایک ترقی یافتہ قوم کی لین دین کی جملہ ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے۔اول کاتبوں یا وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی۔وہ لکھنے سے انکار نہیں کر سکتے اور لکھانے والے کو معاوضہ دینا ضروری ہے۔دوم۔گواہ ہوں۔وہ گواہی دینے سے انکار نہیں کر سکتے۔مگر جو اِن کو بطور گواہ بلاتا ہے وہ ان کے کاروبار کے ہرجہ کا معاوضہ دے۔سوم معاملہ کرنے والا بچہ ہو یا بوڑھا یا مال کی حفاظت نہ کر سکتا ہو یا کوئی اور امر مانع ہو تو اس کا ولی مقرر کیا جائے۔غرض ایک ایک فقرہ میں ایک ایک قانون کی بنیاد قائم کر دی ہے آگے اس پر قانون بن سکتے ہیں۔

یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے شہادت میں دو گواہوں کا ہونا بلحاظ حالات عامہ ہے۔عموماً دو گواہوں سے بات مضبوط ہو جاتی ہے۔جھوٹ کی ملاوٹ کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔بیان کا جو حصہ ایک دوسرے کی تائید میں ہو وہ وزنی ہو جاتا ہے۔یہ حکم نہیں کہ اگر ایک ہی گواہ ہو تو فیصلہ نہ کیا جائے یا قرائن کی شہادت پر فیصلہ نہ کیا جائے۔بلکہ حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں جہاں قمیض کے آگے یا پیچھے سے پھٹنے کا ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ قرائن کی شہادت پر بھی فیصلہ ہو سکتا ہے۔

عورت کی گواہی

اور ایک مرد کی جگہ جو دو عورتوں کی شہادت رکھی تو اس کی وجہ بھی خود ہی بتا دی، کہ عورتوں کو

چونکہ معاملات لین دین سے واسطہ کم پڑتا ہے، اس لئے ایسی باتوں کو شاید وہ اچھی طرح یاد نہ رکھ سکیں۔ تو ایک کی کمی کو دوسری پورا کردے۔ اکیلی عورت کی شہادت نا قابل قبول ہونے کا ذکر کہیں نہیں۔ بلکہ لعان کے معاملہ میں جو وزن مرد کی چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے وہی وزن عورت کو چار مرتبہ شہادت کو دیا ہے گویا مرد اور عورت کی شہادت میں کوئی فرق نہیں کیا۔ ولادت بکارت وغیرہ معاملات میں فقہا نے بھی عورت کی شہادت کو پورا وزن دیا ہے۔

9۔ حضرت مریم صدیقہؑ کو ملنے والا رزق

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِاللّٰه (ال عمران۔ آیت ۳۷)۔ ''جب کبھی زکریاؑ اس کے پاس عبادت گاہ میں آتے اس کے پاس رزق پاتے۔ کہا: اے مریم! یہ تجھے کہاں سے ملا؟ اس نے کہا: یہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

رزق کے اصلی معنی امام راغب کے نزدیک عطاء جاری ہیں خواہ دنیوی ہو یا اُخروی، مال ہو یا جاہ یا علم۔ اس لئے رُزِقْتُ علماً علم دیا پر بولتے ہیں۔ مفسرین نے تو حسب معمول اس کو غیر معمولی رزق قرار دیا۔ حالانکہ یہاں کوئی ایسے لفظ نہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں **فاكهة الصيف فى الشتاء وفاكهة الشتاء فى الصيف** یعنی گرمی کے پھل سردیوں میں اور سردی کے پھل گرمیوں میں۔ حالانکہ قرآن شریف میں نہ روٹی کا ذکر ہے نہ پھلوں کا۔ اول تو رزق سے مراد پھل ہی لینا اس پر کوئی دلیل نہیں۔ پھر پھل بھی خلاف موسم اور یہ بھی لکھا ہے کہ زکریا اس پر سات دروازوں پر قفل لگایا کرتے تھے۔ ان قفلوں میں تو معمولی پھلوں کا پہنچنا بھی کافی اعجاز تھا خلاف موسم بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اور مجاہد سے روایت ہے۔ **وجد عندها رزقا اى علما او قال صحفا فيها علم رث)** یعنی رزق سے مراد یہاں علم ہے یا صحیفے جن میں علم تھا۔

من عند الله عند ظرف مکان اور زمان ہے اور اس کے معنی **حضُور الشَّى وَرُنُوهُ** یعنی کسی شئے کا حضور اور اس کا قرب اور اس پر **من** داخل ہوتا ہے۔ جس طرح **لدن** پر **من** داخل ہوتا ہے۔ یعنی **من عندنا . من لدنّا**. مفردات میں ہے کہ **عند** میں قرب ہے وہ بعض وقت بلحاظ مکان ہوتا ہے اور بعض وقت بلحاظ اعتقاد جیسے **عندى كذا** یعنی میرے اعتقاد میں یوں ہے۔ اور کبھی مرتبہ کے لحاظ سے جیسے **بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْد ربهم** ۔ میں اور کبھی محض حکم میں جیسے **عنده علم**

الساعة (الزخرف 43-85) **ومن عنده علم الکتاب** (الرعد 43) ایسا ہی **فاولئک عند الله هم الکاذبون** (النور 24-13) **وهو عند الله عظیم** (النور 24-15) ان تمام مقامات پر **فی حکمه** مراد ہے یعنی اللہ کے حکم میں، اسی طرح پر **وان من شئی الا عندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم** (الحجر 15-21) اور یہی صورت یہاں ہے **من عند الله** یعنی اللہ کے حکم سے یہ چیزیں پہنچتی ہیں۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس کو **من عندالله** اس لئے کہا گیا ہے کہ بلا واسطہ بشر پہنچتا تھا۔ مگر یہ ضروری نہیں **ان من شئی الا عندنا خزائنه**، جب سب چیزوں کے خزانے اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں تو جو کچھ پہنچتا ہے سب **من عند الله** ہی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں۔ **هذه من عند الله** یہ اللہ کا احسان ہے اور جب کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو کہتے ہیں **هذا من عندک** یعنی تمہاری بے تدبیری سے ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا **قل کل من عند الله** (النساء 78) بھلائی برائی ہر چیز اللہ کی طرف سے ہی ہے، حالانکہ اسی کی تشریح آگے چل کر یوں کی ہے کہ بدنتائج انسان کے اپنے بداعمال سے ہیں۔ اسی طرح فرماتا ہے **مالانصر الا من عند الله** (آل عمران 3-125) حالانکہ نصرت اسباب کے ساتھ ہی آتی ہے۔ اگر مسلمان قتال نہ کرتے اور حضرت موسیٰ کے ساتھیوں کی طرح انکار کر دیتے تو یہ نصرت بھی نہ ملتی۔ پس بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہر چیز من عنداللہ ہی ہے۔

مریم کے پاس رزق کا پہنچنا

ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی کوئی امر مہیا کر دے یا ایسے اسباب سے مہیا کر دے جن کے سمجھنے پر انسان قادر نہیں، جیسے **ویرزقه من حیث لایحتسب** (الطلاق 65-3) اللہ تعالیٰ متقی کو ایسے ذرائع سے رزق پہنچاتا ہے جہاں سے اس کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ مریم صدیقہ کی کرامت ہو کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر انکو پہنچ جاتا ہو، تو اس سے بھی ہمیں انکار نہیں۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ آیا قرآن کریم نے یہاں ایسا فرمایا ہے یا کسی حدیث صحیح میں ایسا آیا ہے کہ مریم کو بے موسم کے پھل سات قفلوں کے اندر پہنچ جایا کرتے تھے، اس کا جواب نفی میں ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ نے ایسا فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور الفاظ ظاہری سے سوائے اس کے کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ مریم کے پاس کچھ رزق پہنچ جاتا تھا۔ ممکن ہے

زائرین پہنچاتے ہوں جیسا کہ دستور ہے کہ جولوگ خلوت نشینی اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کسی کے دل میں ڈال کر اُن کو پہنچا دیتا ہے۔ اور ممکن ہے یہاں رزق سے مراد جیسا مجاہد نے کہا ہے علم ہو، اور اس علم کو ہی مریم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا ہو۔ تو اس پر ایک دن جب زکریا نے سوال کیا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے پہنچتا ہے تو اس نے وہی خدا پرستوں والا جواب دیا۔ جن کی نظر وسائل سے بلند ہوتی ہے اور وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت ابراہیم تو یہاں تک فرماتے ہیں وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ (الشعراء26-79) وہ اللہ ہے جو مجھے کھانا کھلاتا اور پانی پلاتا ہے حالانکہ اپنے ہاتھ سے کھاتے اور پیتے تھے۔

کہا جائے گا کہ اگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی تو اسکا ذکر یہاں کیوں کیا۔ لیکن کیا قرآن کریم معمولی امور کا ذکر نصیحت کے لئے نہیں کرتا؟ بلکہ سبق تو انسان معمولی امور سے ہی حاصل کرسکتا ہے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی امر تھا تو ہمیں اس سے فائدہ کیا، یہ کوئی معجزہ تو ہے نہیں کہ مخالفین پر اتمام حجت کے لئے دکھایا گیا ہو۔ نہ کوئی ایسی کرامت ہے جو منکرین کے لئے ظاہر ہوئی ہو، بلکہ بات صاف ہے مسلمانوں کو سمجھانا مقصود ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے اور اس کے دین کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لئے بھی رزق کا کچھ سامان کر دیتا ہے اور کسی نہ کسی ذریعہ سے اس کو رزق پہنچا دیتا ہے۔ بلکہ آخر پر ان الفاظ میں کہ **واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب** یہ بھی بتا دیا کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ بے حساب رزق دیتا ہے انہی الفاظ میں مسلمانوں کو بھی مخاطب فرمایا ہے۔

ایک اور بات قابل توجہ یہ ہے کہ زکریا ہمیشہ ہی جب اس کے پاس جاتے تو رزق پاتے۔ اگر یہ کوئی غیر معمولی رزق ہوتا تو یہ سوال پہلے دن ہی ان کو کرنا چاہئے تھا کہ اے مریم یہ تم کو کہاں سے ملا۔ حالانکہ عبارت قرآنی بتاتی ہے کہ وہ جب کبھی مریم کے پاس جاتے ایسا پاتے اور سوال نہ کرتے۔ پھر انہوں نے کسی ایک موقعہ پر ایسا سوال کیا ہے۔ جب انہوں نے مریم میں خدا پرستی کے آثار دیکھے ہیں۔ اگر یہ مراد ہوتی کہ پہلی مرتبہ ہی دیکھ کر سوال کیا تھا تو عبارت یوں ہونی چاہئے تھی۔ **لَمَّا دَخَلَ عَلَیْهَا**. ..... پس جب مریم کے اندر انہوں نے ایسی نیکی اور سعادت دیکھی تو ان کی طبیعت میں بھی ایک جوش پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی ایسی نیک اولاد عطا کرے۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکوں کے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے تو نیک اولاد کے لئے ہی پیدا ہوتی ہے۔ باوجود بوڑھا ہو جانے کے زکریا نے اولاد کے لئے دعا نہ کی۔ کی تو یہی کی اے خدا نیک اولاد دے۔(بیان القرآن۔ص۲۰۳ تا۲۰۴)

نوٹ: بالکل یہی رائے مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے اپنی عالمانہ تفسیر ''تدبر القرآن'' میں ظاہر کی ہے۔(خورشید)

10۔ بن یامین کے بورے میں پیالہ رکھنے والے حضرت یوسف نہ تھے

جَعَلَ السِّقَايَةَ (لفظی ترجمہ۔ کسی مرد نے پیالہ رکھا۔سورہ یوسف 70:12) میں ضمیر کس طرف جاتی ہے؟ مفسرین کا خیال یوسفؑ کی طرف ہے۔ گویا حضرت یوسف نے خود بوری کے اندر پیالہ رکھا۔ مگر اس پر قرآن شریف کے الفاظ کئی قسم کی مشکلات وارد کرتے ہیں۔ خود ایسی کارروائی کر کے پھر سب لوگوں میں یہ اعلان کرانا کہ یہ قافلہ والے چور ہیں۔ **اَيَّتُهَا الْعِيْرُ اِنَّكُمْ لَسَارِقُوْن.** ایک نبی کے کس طرح شایان شان ہوسکتا ہے؟ یہ تو ایک معمولی آدمی بھی کرے تو قابل گرفت ہے۔ قرآن شریف میں ہے **وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا** (النساء: 4-112) ایک شخص خود ایک گناہ کرے پھر اسکا الزام دوسرے پر لگائے تو وہ ارتکابِ بہتان کرتا ہے۔ مفسرین اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ان کو **سارق** اس لحاظ سے کہا کہ انہوں نے خود یوسف کو اپنے باپ سے چرایا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ جو الزام اہل مصر کے سامنے اعلان ہوا وہ تو یہ تھا کہ تم نے پیالہ چُرایا ہے اور اس کے وہ مرتکب نہ تھے۔ اور آخر کار انہی میں سے ایک کی بوری سے اُسے نکال کر اہل مصر کی نظر میں انہیں چور ٹھہرا بھی دیا۔ پس قرآن کریم کا منشاء ہرگز یہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت یوسف نے خود وہ پیالہ بوری میں رکھایا رکھوایا۔ اس سے پہلے جب روپیہ ان کو واپس کیا گیا تو یہ لفظ ہیں کہ اپنے نوکروں کو کہا کہ ان کا روپیہ ان کی بوریوں میں رکھ دو۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ بوریوں کا بھرنا بھرانا حضرت یوسف کا اپنا کام نہ تھا اور نہ وہ کام آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ اس لئے اگر پیالہ حضرت یوسف نے رکھوانا ہوتا تو اسی طرح اپنے نوکروں کو حکم دیتے جس طرح روپیہ رکھنے کے لئے دیا تھا۔ اس لئے اس کا رکھنے والا کوئی اور

تھا۔قرآن شریف سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت یوسف کے ساتھ ان کے بھائیوں نے ایک بھاری شرارت کی تھی اسی طرح بن یامین کے ساتھ بھی کی۔ چنانچہ جب حضرت یوسف اپنے آپ کواُن پر ظاہر کرتے ہیں تو یوں فرماتے ہیں۔هَلْ عَلِمْتُمْ مَافَعَلْتُمْ بِيُوْسُفَ وَ اَخِيْهِ (۸۹)(ترجمہ۔کیاتم جانتے ہوکہ تم لوگوں نے یوسف اوراس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا؟) اب ظاہر ہے کہ اور کوئی واقعہ بن یامین کے ساتھ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کے ساتھ قریباً قریباً ویسا ہی سلوک ہوا ہوجیسا یوسف کے ساتھ ہوا تھا۔صرف یہی ایک واقعہ ہے اوران کی شرارت کی مزید تائیداس بات سے ہوتی ہے کہ انہوں نے چوری کا جھوٹا الزام یوسف پر بھی لگایا۔ قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (۷۷)۔اگراس نے چوری کی ہے تواس کے بھائی یوسف نے بھی چوری کی تھی۔حالانکہ یہ دونوں جھوٹ تھے۔گویا بجائے صفائی کی شہادت پیش کرنے کے اور چوری کے الزام کی تائید کا مطلب یہی ہوا کہ یہ دونوں بھائی چور ہیں۔اور حضرت یعقوب سے جب انہوں نے جا کر یہ ذکر کیا کہ تیرے بیٹے نے چوری کی ہے تو انہوں نے اس کا الزام انہی پر دیا بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا (۸۳) جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ تمہاری ہی کوئی شرارت ہے۔پس اصل واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بھائیوں میں سے کسی نے محض شرارت کے طور پر پیالہ اٹھا کر بن یامین کی بوری میں رکھ دیا تا کہ یوسف کی طرح وہ بھی حضرت یعقوب کی نظروں سے دور ہوجائے۔اس میں شک نہیں کہ بائبل میں یہی ذکر ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے نوکروں کو پیالہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔مگر بائبل نے قبیح ترین افعال انبیاء کی طرف منسوب کیے ہیں۔حضرت لوط کی طرف زنا، وہ بھی بیٹیوں کے ساتھ، حضرت ہارون کی طرف شرک، حضرت سلیمان کی طرف بت پرستی، حضرت داؤد کی طرف زنا۔اور قرآن کریم نے ایسے تمام ناپاک الزامات سے انبیاء علیہم السلام کی بریت کی ہے اور عصمت انبیاء کا اصول سکھایا ہے۔اس لئے حضرت یوسف کی طرف ایسا فعل اگر بائبل منسوب کردے تو اس کی معمولی تحریفات میں سے ایک ہے مگر قرآن کریم ایسا نہیں کرسکتا۔'' (بیان القرآن۔فٹ نوٹ ۱۵۶۵)

آگے آیت ۷۶ میں آتا ہے كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ۔''اسی طرح ہم نے یوسفؑ کیلئے ارادہ کیا''۔ كِدْنَا. كَاد. بمعنی اَرَادَ۔۔۔۔''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہمارا ارادہ یوسف کے لئے ایسا ہی ہوا کہ ان کا بھائی ان کے پاس رہ جائے۔ کدنا بمعنی ارادنا ہونا، اس سے بھی ظاہر ہے کہ آگے آتا ہے الا ان یشاء اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ارادہ اور مشیت سے ایسا ہوا۔اور اگر

کدنا بمعنی تدبیر بھی لیا جائے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ تدبیر ہم نے یوسف کے لئے کی۔ یہ نہیں فرمایا کہ یوسف نے یہ تدبیر کی۔ اور اِس صورت میں کـدنـا کے لفظ میں یہ اشارہ ہوگا کہ ان کے بھائیوں کی تدبیر تو یہ تھی کہ بن یامین کسی طرح واپس حضرت یعقوب کے پاس نہ جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو یوسف کے حق میں کر دیا کہ بھائی بھائی کے پاس رہ گیا۔ وہ خود بغیر افشائے راز کے اسے نہ رکھ سکتے تھے۔ اور اس حقیقت کو وہ ابھی ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔ مشیت الٰہی سے یہ ایک سامان پیدا ہو گیا کہ بن یامین حضرت یوسف کے پاس رہ گئے۔۔۔ اگر یوسف نے خود یہ کام کیا ہوتا تو یہاں نـرفـع درجـات من نشـاء کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ کیونکہ بہر حال یہ ایک چالبازی تھی اور چالبازی کے موقعہ پر رفـع درجات موزون نہیں۔ ہاں خود بخود اس سامان کا پیدا ہو جانا رفع درجات پر گواہ ہے۔ یعنی جب انسان اللہ تعالیٰ کے لئے ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فائدہ کے سامان خود بخود پیدا کر دیتا ہے۔'' (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ۔ ۱۵۷۰)

11۔ حضرت سلیمانؑ اور اُن کے عصا کو دیمک کے کھانے کا قصہ

مفسرین نے یہاں (یعنی سورت سبا 34 آیت 14 کے متعلق) ایک قصہ لکھا ہے کہ حضرت سلیمان کی جب وفات قریب آئی تو انہوں نے دعا کی کہ میری موت کا علم جنوں کو نہ ہو، تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جن علم غیب نہیں جانتے جیسا کہ انہیں دعویٰ تھا۔ چنانچہ آپ ایک عصا کا سہارا لئے کھڑے ہوئے حالت عبادت میں فوت ہو گئے اور اسی طرح ایک سال کھڑے رہے یہاں تک کہ دیمک نے عصا کو کھا لیا۔ تب آپ گر پڑے اس قصہ کی کوئی اصلیت توریت میں نہیں ہے اور گو ابن جریر نے اسے حدیث مرفوع کے طور پر بیان کیا ہے۔ مگر ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی صحت میں نظر ہے اور اسے غریب اور منکر کہا ہے۔ اور جنوں کو تو علم غیب کا دعویٰ تھا مگر کیا اس زمانہ میں انسانوں کو بھی سمجھ نہ آتا تھا کہ حضرت سلیمان نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں۔ نہ پیشاب یا پاخانہ کے محتاج ہیں۔ پھر اس عرصہ میں امور مملکت کس طرح طے پاتے تھے؟ حضرت سلیمان بادشاہ تھے

اور جس طرح اللہ تعالیٰ کی عبادت ان پر فرض تھی امور سلطنت کو سرانجام دینا بھی ان کے ذمہ تھا۔ پھر عصا کے سہارے سے لاش کا کھڑا رہنا بھی قیاس میں نہیں آ سکتا سوائے اسکے کہ اسے بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کی نعش مبارک کا ایک معجزہ بنالیا جائے، اور ایک نبی کی لاش کی یہ بے حرمتی ہے کہ ایک سال تک وہ دفن بھی نہ ہو۔ اور بظاہر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس مضمون کا یہاں کیا تعلق ہے اگر ایسا ہوا بھی تو اس کو اس موقعہ پر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ حضرت سلیمان پر اپنی نعمتوں کے ذکر کے بعد بتانا تو یہ چاہئے تھا جیسا آگے سبا کے ذکر میں بتایا ہے کہ جب پچھلے لوگوں نے ناشکری کو تو اللہ تعالیٰ نے وہ نعمتیں چھین لیں۔ جنّ غیب جانتے تھے یا نہ جانتے تھے۔ اس کا یہاں کیا تعلق ہے اور جنوں کے سلیمان کے ماتحت ہوتے ہوئے کون خیال کر سکتا تھا کہ جنّ علم غیب جانتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت سلیمان کی وفات کے جلد ہی بعد اس سلطنت کی حالت خراب ہوگئی۔ حضرت سلیمان کے بیٹے رحبعام کے تخت نشین ہونے کے تھوڑی دیر بعد یربعام کی انگیخت پر بنی اسرائیل نے کچھ مطالبات پیش کیے اس وقت حضرت سلیمان کے پرانے مشیروں نے رحبعام کو یہ مشورہ دیا کہ وہ قوم کو تنگ نہ کرے اور ان کے مطالبات کو قبول کرے مگر اس نے بجائے ان مشیروں کی بات سننے کے اپنے نوجوان ساتھیوں کے کہنے پر بنی اسرائیل کے مطالبات کا سخت جواب دیا اور ان پر سختی کرنے کی ٹھانی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس قومیں باغی ہوگئیں اور حضرت سلیمان کی سلطنت برباد ہوگئی اور رحبعام کی حکومت صرف ایک چھوٹی سی شاخ پر رہ گئی (اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسرائیلی قومیں بھی آزاد ہوگئیں) دیکھو سلاطین باب 12۔ پس **دابة الارض** یہی رحبعام حضرت سلیمان کا بیٹا ہے جس کی نظر صرف زمین تک محدود تھی اور سلیمان کے عصا کا کھایا جانا اس کی سلطنت کی بربادی ہے۔ اور جنّ سے مراد غیر قومیں ہیں جنہوں نے اب تک بنی اسرایل کی ماتحتی کا جوا اٹھایا ہوا تھا۔ (بیان القرآن۔ فٹ نوٹ ۲۶۸۵)

(نوٹ) بالکل یہی بات علامہ رحمت اللہ طارق نے ''برہان القرآن'' میں لکھی ہے۔ (خورشید)

12۔آیت خَاتَمُ النَّبِیّٖن اور اُس کی تشریح

خَاتَمُ النَّبِیّٖن (33:40)۔انبیاءعلیہم السلام ایک قوم ہیں اور کسی قوم کا خَاتَم یا خَاتِمُ ہونا صرف ایک ہی معنٰی رکھتا ہے یعنی ان میں سے آخری ہونا۔پس نبیوں کے خاتم کے معنی نبیوں کی مہر نہیں بلکہ آخری نبی ہیں۔یہاں ان سب احادیث کے نقل کرنے کی گنجائش نہیں جن میں خَاتَمُ النَّبِیّٖن کی تشریح کی گئی ہے۔یا جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی کا نہ آنا بیان کیا گیا ہے،اور یہ احادیث متواترہ ہیں جو صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے مروی ہیں،اور امت کا اس پر اجماع ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی نہیں۔حدیث اول جس میں لفظ خَاتَمُ النَّبِیّٖن کی تفسیر زبان نبویؐ سے مروی ہے متفق علیہ ہے **مثلی ومثل الانبیاء کمثل رجل بنی بیتا فاحسنہ واجملہ الاموضع لبنۃٍ من زاویۃٍ فجعل الناس یطوفون بہ ویتعجبون لہ ویقولون ھَلَّا وضعت ھذہ اللبنۃ قال فانا اللبنۃ وانا خاتم النبیین** ۔یعنی میری مثال اور نبیوں کی مثال ایک شخص کی مثال ہے جس نے ایک گھر بنایا اور اسے اچھا اور خوبصورت بنایا سوائے کونے کی اینٹ کے تو لوگ اس کے گرد گھومتے اور تعجب کرتے اور کہتے یہ اینٹ کیوں نہیں لگائی سو میں وہ اینٹ ہوں اور میں خاتم النبیین ہوں۔اور دوسری حدیث متفق علیہ میں لفظ **خاتم النبیین** کی تفسیر یوں کی ہے . **انہ سیکون فی امتی ثلثون کذابا کلھم بزعم انہ نبی وانا خاتم النبیین لانبی بعدی** یعنی امت میں تیس کذاب ہوں گے۔ہر ایک ان میں سے دعویٰ کے گا کہ وہ نبی ہے اور میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں۔اور تیسری حدیث میں جو مسلم ترمذی نسائی کی ہے یہ ذکر ہے کہ مجھے چھ چیزوں میں دوسرے انبیاء پر فضیلت دی گئی ہے جن میں چھٹی یہ ہے کہ **خُتِم بی النبیون** یعنی میرے ساتھ نبی ختم کیے گئے ہیں۔وہاں بجائے **خاتم النبیین** کے یہ لفظ رکھ کر بتا دیا کہ **خاتم النبیین** سے یہی مراد ہے نہ کچھ اور وہ احادیث جن میں آپ کے آخری نبی ہونے کا ذکر ہے اور وہ بھی درحقیقت **خاتم النبیین** کی تفسیر ہی ہیں،بہت سی ہیں مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل میں نبی کے بعد نبی آتا تھا لیکن میرے بعد نبی نہ

آئے گا بلکہ خلفاء ہوں گے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتا۔ اور ایک میں ہے کہ علیؓ کی نسبت میرے ساتھ وہی ہے جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں، اور ایک میں ہے کہ میرا نام عاقب ہے اور عاقب وہ ہے جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو **انا العاقب والعاقب الذی لیس بعدہ نبی** ۔ اور ایک میں ہے کہ نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا مگر مبشرات، اور ایک میں ہے کہ نبوت اور رسالت منقطع ہوگئی اور دس حدیثوں میں ہے **لانبی بعدی** یعنی میرے بعد کوئی نبی نہیں اور ایسی حدیثیں جن میں آپ کو آخری نبی کہا گیا ہے چھ ہیں۔ اس قدر زبردست شہادت کے ہوتے ہوئے کسی مسلمان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے سے انکار کرنا بینات اور اصول دینی سے انکار ہے۔

لو عاش ابراھیم لکان نبیا پر بحث

اور اس کے خلاف جو کچھ احادیث میں سمجھا گیا ہے وہ ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے **لو عاش ابراھیم لکان نبیا**. مگر اول اس سے امکان نبوت نہیں نکلتا بلکہ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے **لو کان فیھما الھۃ الا اللہ لفسدتا** جس طرح یہاں دو خداؤں کا ہونا اور فساد دونوں ممتنع امر ہیں۔ اسی طرح وہاں ابراہیم کا زندہ رہنا اور اس کا نبی ہونا دونوں ممتنع امر ہیں۔ دوسرے اس حدیث کی سند میں ضعف ہے کیونکہ اس میں ابوشیبہ ابراہیم ہے جسے ضعیف کہا گیا ہے۔ تیسرے اس کی تشریح دوسرے اقوال سے ہوتی ہے۔ مثلاً بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی کا قول **لو قضی بعد محمد صلعم نبی عاش ابنہ ابراھیم ولکن لانبی بعدہ** یعنی اگر آنحضرت صلی اللہ کے بعد کوئی نبی مقدر ہوتا تو آپ کا بیٹا ابراہیم زندہ رہتا لیکن آپ کے بعد کوئی نبی نہیں یا انس کا قول **ولو بقی لکان نبیا لکن لم یبق لان نبیکم آخر الانبیاء** یعنی اگر ابراہیم زندہ رہتا تو نبی ہوتا لیکن وہ باقی نہیں رہا کیونکہ تمہارے نبی آخری نبی ہیں۔

حضرت عائشہؓ کا قول

جس کی سند کوئی نہیں **قُوْلُوْا خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ وَلَاتَقُوْلُوْا لَانَبِیَّ بَعْدَہٗ . خَاتَمَ النَّبِیِّیْن** کہو اور یہ نہ کہو کہ آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور اس کا یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ

کے نزدیک خَـاتَـمُ النَّبِیین کے معنی کچھ اور تھے۔کاش وہ معنی بھی کہیں مذکور ہوتے۔حضرت عائشہؓ کے اپنے قول میں ہوتے، کسی صحابی کے قول میں ہوتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں ہوتے۔مگر وہ معنی دو بطن قائل ہیں اور اس قدر حدیثوں کی شہادت جن میں خَاتَمُ النَّبِیین کے معنی لانبی بعدی کیے گئے ہیں ایک بے سند قول پر پس پشت پھینکی جاتی ہیں۔یہ غرض پرستی ہے خدا پرستی نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیس حدیثوں کی شہادت ایک بے سند قول کے سامنے رد کی جاتی ہے۔اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو کیوں اس کے معنی یہ نہ کیے جائیں کہ حضرت عائشہؓ کا مطلب یہ تھا کہ دونوں باتیں اکٹھی کہنے کی ضرورت نہیں۔خَـاتَـمُ النَّبِیین کافی ہے۔جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ کا قول ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے کہا خَـاتَـمُ الانبیاء وَلاَ نَبِی بَعْدَہٗ تو آپ نے کہا خَـاتَمُ الانبیاء کہنا تجھے بس ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا مطلب ہو کہ جب اصل الفاظ خَـاتَـمُ النَّبِیین واضح ہیں تو وہی استعمال کرو یعنی الفاظ قرآنی کو الفاظ حدیث پر ترجیح دو۔اس سے یہ کہاں نکلا کہ آپ الفاظ حدیث کو صحیح نہ سمجھتی تھیں۔اور اتنی حدیثوں کے مقابل اگر ایک حدیث ہوتی تو وہ بھی قابل قبول نہ ہوتی، چہ جائے کہ صحابی کا قول جو شرعاً حجت نہیں۔

ختم نبوت اور نزول عیسیٰ

اور یہ خیال جو لوگوں میں پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نبی اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد واپس آئیں گے یہ بھی اس نص صریح کے خلاف ہے۔حضرت عیسیٰ ایک روشن چراغ تھے جنہوں نے ایک ضرورت کے وقت صرف بنی اسرائیل کے ایک گھرانے کو روشن کیا۔ ورسولا الی بنی اسرائیل (آل عمران ۳:۴۹)۔محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آفتاب عالمتاب ہیں۔

---

(۱) اس تشریح کو مولانا وحید الدین خان نے بھی تسلیم کیا ہے۔احمدیوں کی طرح اب وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دیگر انبیاء کرام کی طرح وفات پا چکے ہیں۔اور اس بات کو عصر حاضر کے بیسیوں نامور غیر احمدی مفسر، مفکر اور عالم بھی مان چکے ہیں۔پس ایسے میں مسلمانوں کے لئے دو ہی راستے کھلے ہیں : ایک یہ کہ اُن ڈھیر ساری احادیث صحیحہ کا سرے سے ہی انکار کر دیں جن میں مسیح کے دوبارہ آنے کا ذکر ہے۔لیکن یہ نہج درست نہ ہوگی۔کیونکہ اس سے احادیث پر سے ہی اعتبار اٹھ جائے گا۔اس لئے لازماً یہی ماننا پڑے گا کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا ظاہر ہوگا جو حضرت عیسیٰ کا رول ماڈل ہوگا۔یعنی مثیل مسیح بن کر آئے گا۔(دیکھو الرسالہ۔مئی۔۲۰۱۰ء)۔خورشید

وسراجا منیراً ۔(الاحزاب۳۳:۴۶) آفتاب کے نکل آنے کے بعد چراغ روشن نہیں ہوا کرتے ۔ یہ فعل تو انسان بھی نہیں کرتا خدائے حکیم کی طرف کیونکر منسوب ہوسکتا ہے۔ پھر اگر حضرت عیسیٰ آجائیں تو ختم نبوت باطل ہوئی۔ کیوں کہ نبی نبوت سے معزول نہیں ہوسکتا۔ جب حضرت عیسیٰ آئیں گے نبی ہوکر ہی آئیں گے۔ اور یہ کہنا کہ نبی تو ہوں گے مگر کام نبوت کا نہیں کریں گے اور بھی عجیب بات ہے۔ وہ خدا بھی عجیب ہے کہ ایک نبی کو بھیجتا ہے مگر کام نبوت کا اس سے کچھ نہیں لیتا۔ اور پھر عملاً یہ عہدہ نبوت سے معزولی ہے۔ سوال صاف ہے اگر ختم نبوت ایک فرضی شئے ہے تو چاہے ہزاروں نبی آئیں اور اگر یہ ایک حقیقت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہا اور تکمیل کو پہنچ گیا، تو جیسے نیا نبی نہیں آسکتا پرانا بھی نہیں آسکتا۔ اور احادیث میں جو عیسی ابن مریم کے آنے کا ذکر ہے تو اس سے مراد سوائے اس کے کچھ نہیں ہوسکتی کہ ایک عیسی صفت انسان اس امت میں بھی پیدا ہوگا۔ اور انہی حالات کے ماتحت پیدا ہوا جن حالات کے ماتحت حضرت عیسیٰ بنی اسرائیل میں آئے تھے۔(۱)

مومنوں کے لئے روحانی باپ

اس آیت کا یہاں کیا تعلق ہے؟ اصل مضمون تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہونا تھا، اور یہ کہ مومنوں کا تعلق آپ سے روحانی تعلق ہے اور آپ مومنوں کے لئے روحانی طور پر باپ ہیں۔ اسی مضمون کو یہاں ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن چونکہ اس سے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی ابوت کی نفی کا اشتباہ پیدا ہوتا تھا اس لئے حرف استدراک لکن سے فی الفور اس کا ازالہ کیا اور فرمایا رسول اللہ ، وہ اللہ کے رسول ہیں یعنی روحانی طور پر تمہارے باپ ہیں۔ کیونکہ ہر ایک رسول اپنی امت کے حق میں روحانی طور پر باپ کا حکم رکھتا ہے۔ جس طرح جسم کی ابتداء باپ سے ہوتی ہے روحانیت کی ابتدا رسول سے ہوتی ہے۔ پس رسول اللہ کا لفظ لاکر آپ کی ابوت روحانی کو قائم کیا۔ لیکن یہاں پھر ایک وہم پیدا ہوتا تھا کہ جس طرح پہلے رسولوں کے بعد دوسرے رسول آجاتے رہے تو رسولوں کی ابوت روحانی منقطع ہوجاتی رہی، کیا اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوگا تو فرمایا ایسا نہیں

ہوگا۔ بلکہ آپ خَاتَمُ النَّبِیین بھی ہیں یعنی آخری نبی اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔اس لئے آپؐ کی ابوت روحانی کا سلسلہ بھی تا قیامت منقطع نہ ہوگا، بلکہ جو فیض ملے گا وہ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ملے گا۔اور اسی فیض کے پانے سے ہی آپ کی امت کے لوگ مثیل انبیاء ہوں گے۔ علماء امتی کانبیاء نبی اسرائیل. وہ نبی نہ ہوں گے پر نبیوں کی طرح ہوں گے۔ وہ نبی نہ ہوں گے پر اللہ تعالیٰ ان سے ہم کلام ہوگا۔رجال یکلمون من غیر ان یکونوں انبیاء اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری ہے۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفت کلام معطل نہیں ہوسکتی۔لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم کی دلیل ہے کہ تمام دنیا کی ضروریات مذہبی کے متعلق مکمل ہدایات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمادیں۔اسی لئے آیت کا خاتمہ بکل شئی علیما پر کیا ہے۔ ہدایات دینی مکمل ہوگئیں لیکن تعلق باللہ ختم نہیں ہوا بلکہ ان ہدایات کی بدولت پہلے سے بھی بڑھ کر حاصل ہوتا ہے۔

13۔سورۃ الاخلاص

توحید کی جامع تعلیم اور شرک کی کامل تردید

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ(۱) اَللّٰهُ الصَّمَدُ(۲) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ(۳) وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ(۴) ترجمہ. کہہ اللہ (تعالیٰ) ایک ہے۔اللہ (تعالیٰ) بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔اور اسکا کوئی ہمسر نہیں۔

’’۔۔۔اس چھوٹی سی سورت میں وحدانیت باری تعالیٰ کے سارے پہلوؤں کو شامل کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کا ابطال کیا ہے۔پہلی آیت میں اس کا احد ہونا بیان کیا ہے یعنی وہ اپنی ذات میں اکیلا ہے اور یوں ہر قسم کی شرک فی الذات اور تثلیث وغیرہ کی تردید کی ہے۔دوسری آیت میں اس کا صمد ہونا بیان کیا ہے۔یعنی وہ جس نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اس لئے سب چیزیں اس کی محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔اس میں اس غلط خیال کی بھی تردید ہے کہ مادہ اور روح کو اللہ تعالیٰ نے پیدا نہیں کیا بلکہ وہ خود بخود ہیں۔اگر ایسا ہوتو پھر اللہ تعالیٰ صمد نہیں

ہوسکتا۔ کیونکہ وہ مادہ اور روح کا محتاج ہوا اور مادہ اور روح اس کے محتاج نہ ہوئے۔ایسا ہی بت پرست قوموں کے اس عقیدہ کی بھی تردید ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے بتوں کی ضرورت ہے **مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى** (الزمر۔31-3)۔تیسری آیت میں خدا کے باپ یا بیٹا ہونے کی تردید ہے اور یہ نصاری کا عقیدہ ہے۔ چوتھی میں اللہ تعالیٰ کا کوئی ہمسر ہونے کی تردید ہے جیسے اوتار ماننے والوں کا عقیدہ ہے یا جیسے آتش پرستوں کا عقیدہ ہے کہ خالق خیر خدا کے مقابلہ پر ایک خالق شر ہے۔

پھر ایک اور پہلو سے ہر قسم کے شرک کی یہاں نفی کی ہے کیونکہ شرک یا ذات میں ہوگا جس کی تردید **احد** میں ہے۔ یا صفات میں ہوگا جس کی تردید **صمد** میں ہے۔یا بلحاظ ولد یا والد ہونے کے ہوگا جس کی تردید **لم یلد ولم یولد** میں کی ہے۔اور یا افعال میں ہوگا یعنی اس جیسا فعل کوئی دوسرا بھی کرسکتا ہے۔جس کی تردید **لم یکن لہ کفواً احد** میں کی ہے۔یوں تمام پہلوؤں سے اس آخری سورت میں اللہ تعالیٰ کی توحید کو کمال کے رنگ میں بیان کیا ہے اور ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹی ہے۔(بیان القرآن۔فٹ نوٹ ۳۶۶۴)

تمت بالخیر

ترین منزل لدھیانہ

12 فروری 2015